نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد (۳۶) فہرست مضامین اگست ۱۹۳۹ء شمار (۲)

ملاحظات	اڈیٹر	۲
اُردو غزل گوئی	اختر اورینوی (ام۔اے)	۹
چین وجاپان کی جنگ سے ہم کو کیا سیکھنا چاہئے	اڈیٹر	۲۴
زندگی اور ادب کا بحرانی دور	مجنوں گورکھپوری	۲۸
میں ملحد کیوں ہوں	اڈیٹر	۳۶
چھتری	فضل احمد صدیقی۔بی۔اے	۴۰
ادب اور اس کے مقاصد	فضل الدین اثر۔ام۔اے	۴۹
مکتوبات نیاز	اڈیٹر	۵۶
باب الاستفسار	اڈیٹر	۶۱
باب المراسلۃ والمناظرۃ	اڈیٹر	۶۸
نکاہات	اڈیٹر	۶۹
کیا آپ کو معلوم ہے؟	اڈیٹر	۷۲
منظومات	(نوابزادہ) راحت سعید خاں بی۔اے۔سروش۔عدم۔انجم۔ندیم۔نبی احمد	۷۵

نگار - جولائی ۳۹ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ (۲)	اگست ۳۹ء	جلد (۳۶)

ملاحظات

حیدر آباد کی دستوری اصلاحات

۱۹ر جولائی ۳۹ء کی وہ ساعت، تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہے گی جب اعلیٰحضرت شہریار دکن نے جدید اصلاحات، کا اعلان فرماکر نہ صرف اپنی ریاست بلکہ ہندوستان کی تمام دوسری ریاستوں کی تاریخ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ فرمایا۔

گورنمنٹ آف انڈیا، ایکٹ ۳۵ء نے ہندوستان میں جس حکومت وفاق کا خاکہ پیش کیا ہے، اس کا تعلق اجتماعی طور پر ریاستوں سے ضرور ہے، لیکن انفرادی حیثیت سے ہر رئیس مجاز ہے خواہ اس میں شرکت کرے، یا نہ کرے، لیکن اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن نے جو ملک و قوم کے مفاد کے لئے ہمیشہ اپنے تشخص ذاتی کو نظر انداز کردیتے ہیں، اس کو محسوس کرلیا کہ اب زمانہ کیا چاہتا ہے، ملک کی خواہشیں کیا ہیں اور وفاق میں شرکت کی جائے یا نہ کی۔ لیکن برطانوی صوبوں کے ساتھ اخلاقی تعاون کے لحاظ سے جدید اصلاحات کی کس قدر ضرورت ہے، چنانچہ اسی جذبہ تعاون و

ہمدردی کی بنا پر جو اعلیٰحضرت کے دل میں تمام ہندوستانی آبادی کے ساتھ پایا جاتا ہے، ایک کمیٹی اصلاحات مقرر فرمائی اور اپنی فطری وسعت نظر کی بنا پر اس کی صدارت ایک ہندو کے سپرد کر دی۔ اس کمیٹی نے جس کا نام آینگار کمیٹی تھا کافی چھان بین کے بعد اپنی رپورٹ باب حکومت میں پیش کی اور اعلیٰحضرت نے مجوزہ اصلاحات میں کچھ اور اضافہ کے ساتھ اس رپورٹ کی سفارشوں کو منظور فرما کر اہل دکن کے ہاتھ میں ایک ایسا دستور حکومت دیدیا جس کی نظیر (اس کی بعض خصوصیات کے لحاظ سے) برطانوی ہند کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔

حکومت کی بنیادی چیز اس کی مجلس مقننہ ہے جس میں عوام کی نیابت زیادہ ضروری ہوا کرتی ہے، چنانچہ کمیٹی اصلاحات نے ایوان مقننہ میں ۷۰ ارکان کی سفارش کی تھی لیکن اعلیٰحضرت نے اس کی تعداد بڑھا کر ۸۵ کر دی جس میں ۴۲ ارکان منتخب ہوں گے اور ۲۸ نامزد شدہ لیکن ان ۲۸ میں سے بھی ۱۴ غیر سرکاری ہوں گے، باقی ارکان میں (علاوہ ارکان باب حکومت کے) صرف خاص مبارک اور بڑے بڑے جاگیری علاقوں کے نمایندے شامل ہیں۔

ایک حد تک تو خیر مجلس مقننہ کی تشکیل میں کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن انتخاب کا طریقہ اور انتخاب کے دایروں کی تعیین نے اس کو بالکل نئی چیز بنا دیا ہے جس کا تجربہ برطانوی ہند میں بھی اس وقت نہیں کیا گیا۔ یعنی ارکان مقننہ کا انتخاب مشترک طور پر ہوگا اور نمایندگی علاقہ وار نہ ہوگی بلکہ معاشی مفادات کی بنیاد پر حلقے انتخاب کئے جائیں گے۔

ایسے ملک میں جہاں مختلف نسل و مذہب کے لوگ نمایاں اقلیت و اکثریت میں پائے جائیں مخلوط انتخاب یقیناً جھگڑے کی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن تمدنی و سیاسی حیثیت سے مختلف قوموں کو متحد کرنے کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے اور حیدرآباد کو فخر کرنا چاہئے کہ اس طریق انتخاب کا عملدرآمد سب سے پہلے وہیں ہو رہا ہے۔ جداگانہ انتخاب کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ فرقہ وارانہ رقابت بڑھ جاتی ہے اور مختلف قوموں میں کبھی ایک دوسرے سے ملکر کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو ملک کی اجتماعی قوت کے لئے نہایت نقصان رساں ہے۔ مخلوط یا مشترک انتخاب میں چونکہ ہر فرقہ کے امیدوار کو دوسرے فرقہ کے رائے دہندگان کا محتاج رہنا پڑتا ہے، اس لئے اخلاقاً نہ سہی تو بر بنائے مصلحت ہی باہمدگر صلح و آشتی سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے اور فرقہ وارانہ جنگ و جدال کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت اس دستور کی یہ ہے کہ اس میں علاقہ وار نمایندگی کے بجائے معاشی مفادات کی نمایندگی رکھی گئی ہے۔ یعنی اس میں جغرافی تقسیم کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ معاشی پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے جس میں سولہ نشستیں زراعت پیشہ لوگوں کے لئے وقف ہیں اور چار تجارت اور صنعت و حرفت والوں کے لئے، اسی طرح ساہوکارہ، مزدوری پیشہ، وکالت، طبابت، تعلیم اور میونسپلٹیوں وغیرہ کے لئے علحدہ علحدہ نشستیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہوگا کہ انتخاب میں وہی شخص آسکے گا جو واقعی صحیح نمایندگی کر سکے اور یہ ممکن نہ ہوگا

کہ زراعت پیشہ علاقہ کی نمایندگی کسی وکیل کے ہاتھ آجائے اور ہریجنوں کی کسی برہمن کے۔ یہ تقسیم تو ان ارکان کی ہوئی جو انتخاب سے آئیں گے، رہ گئے نامزد کردہ اراکین جن میں ۱۴ غیر سرکاری اراکین ہوں گے، سو ان میں بعض قوموں کی نمایندگی کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اور ہریجنوں کے لئے پانچ نشستیں محفوظ کردی گئی ہیں۔

کمیٹی اصلاحات نے مقننہ کے دایرۂ اختیار میں لانے کے لئے صرف ۴۲ مدات کی سفارش کی تھی، لیکن حکومت سرکار عالی نے اس میں اضافہ کرکے ۵۲ مدات پر حاوی کردیا ہے جن کی نسبت مقننہ میں سوالات ہوسکیں گے قرار دادیں پیش کی جائیں گی مسودات قانون بنائے جائیں گے یہاں تک کہ بجٹ بھی زیر بحث آئے گا اور اس پر بھی آزادانہ رائے زنی ہوسکے گی۔

علاوہ مقننہ کے ان وسیع اختیارات کے مشاورتی کمیٹیاں بھی بنائی جائیں گی جن کے ارکان معمولاً وہی ہونگے جو مقننہ کے ہیں یہ کمیٹیاں، مالیات، صحت عامہ، زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم اور اوقاف مذہبی پر اپنی رائے پیش کریں گی اور ان میں سرکاری وغیر سرکاری ارکان کا تناسب ہمیشہ مساوی رہے گا۔

ملازمتوں کے سلسلہ میں آیندہ نہایت سختی سے اس کی پابندی کی جائے گی کہ صرف باشندگان دکن ہی کا انتخاب عمل میں آئے اور امیدواروں کی اہلیت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک تقرراتی مجلس (پبلک سروس کمیشن) قایم کیجائیگی جس میں کم از کم ایک ہندو اور ایک مسلمان رکن ضرور شامل ہوگا۔

آزادی تحریر و تقریر کے سلسلہ میں تمام موجودہ قواعد جن کی رو سے جلسہ ہائے عام کے لئے اجازت حاصل کرلینا ضروری تھا، منسوخ کردئے گئے ہیں۔ اب صرف حکام مجاز کو اطلاع دیدینا کافی ہوگا اور اگر نقض امن وغیرہ کی بنا پر امتناعی احکام صادر نہ ہوں تو ہر جلسہ عام آزادی سے منعقد کیا جاسکتا ہے۔

مذہبی اختلافات کے متعلق کمیٹی اصلاحات نے سفارش کی تھی کہ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے، حکومت سرکار عالی نے بجائے عارضی کمیشن کے تقرر کے ایک مستقل مذہبی کمیٹی بنانا منظور کیا ہے تاکہ آیندہ بھی جب کبھی اس قسم کے جھگڑے پیدا ہوں تو اس سے مشورہ کیا جاسکے، اس کمیٹی میں ہندو مسلمان ارکان کی تعداد مساوی ہوگی۔

مقامی حکومت خود اختیاری کو وسیع کرنے کے لئے تمام اضلاع میں اسی اصول پر میونسپلٹیاں قایم کی جائیں گی جیسی برطانوی ہند میں پائی جاتی ہیں اور ان میں غیر سرکاری و سرکاری ارکان کی نسبت پانچ اور تین کی ہوگی، اسی کے ساتھ ان تمام موضعات میں جن کی آبادی ڈھائی ہزار اور پانچ ہزار کے درمیان ہوگی، پنچایتیں قایم کی جائیں گی اور دیہات سدھار کی انجمنیں آئینی پنچایتوں کی حیثیت اختیار کرکے دستور حکومت کا ایک جزو قرار پائیں گی۔

اس غرض کے لئے کہ اضلاع کی آبادی اپنی ضروریات کا اظہار کرسکے، ہر ضلع میں سالانہ پبلک کانفرنس

منعقد کی جائے گی اور عوام کو اس میں شرکت و رائے زنی کی پوری اجازت ہوگی۔

یہ ہے خلاصہ ان اصلاحات کا جن کا نفاذ حیدر آباد میں ہو رہا ہے اور جن پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد بھی کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی شخصی حکومت میں دفعتاً اہل ملک کو اتنی آزادی دیدینا کتنی وسعتِ نظر چاہتا تھا اور اعلیٰحضرت نے اس باب میں جو فیاضانہ قدم اٹھایا ہے، اس کی مثال حکومتوں کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ لیکن باایںہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف بعض ہندو حضرات ان اصلاحات پر اس لئے قانع نہیں کہ وہ تناسب آبادی کے لحاظ سے اس سے بہت زیادہ کے متوقع تھے اور دوسری طرف مسلمانان حیدر آباد اسلئے برہم ہیں کہ یہ اصلاحات اعلیٰحضرت کے اقتدار شاہانہ پر ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہندو مسلم مساوات مسلمانوں کی معاشی حالت کے لحاظ سے ان کے لئے سخت نقصان رساں ہے۔

میری رائے میں دونوں غلطی پر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حیدر آباد میں ہندو آبادی تقریباً ۸۵ فی صدی ہے اور اس لئے ان کی ۵۰ فی صدی نمایندگی ان کی اکثریت کے تناسب کے لحاظ سے کم ہے، لیکن ان کو سمجھنا چاہئے کہ ملک کی اجتماعی و سیاسی اہمیت کا اندازہ صرف کسی جماعت کی کثرت کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اقلیت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے اگر وہ مخصوص حیثیت سے کوئی خاص وزن رکھتی ہے یا اس کے تحفظ کے لئے کسی خاص رعایت کی ضرورت ہے۔

ہندوؤں سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ حیدر آباد کی سرزمین سے مسلمانوں کا تعلق کتنا دیرینہ ہے۔ اس تعلق کی ابتدا صرف آصفجاہی حکومت سے نہیں ہوتی بلکہ خلجیوں کے زمانہ سے ہوتی ہے جب علاؤالدین محمد نے سنہ ۶۹۳ھ میں دیوگر اور ایلچ پور پر قبضہ کر کے ایک نیا صوبہ "کوہستان ست پڑا" کے جنوب میں قایم کیا تھا۔ اس لئے جس سرزمین سے مسلمانوں کا تعلق تقریباً ۸۰۰ سال سے مسلسل قایم ہو، جہاں ان کے آثار تاریخی بکثرت موجود ہوں اور جہاں کے چپہ چپہ سے اُن کی قومی و مذہبی روایات وابستہ ہوں، وہاں ان کی اہمیت کا اندازہ آبادی سے نہیں بلکہ تاریخ کے اُن صفحات سے کیا جائے گا، جن پر اُن کے کارنامے ہمیشہ کے لئے منقوش ہو چکے ہیں۔ چنانچہ رائے بالمکند (آنجہانی) نے بھی جن کو اصلاحات کی اسکیم بنانے کا کام سپرد کیا گیا تھا، یہی رائے ظاہر کی تھی کہ حیدر آباد کے ساتھ مسلمانوں کا ماضی و حال اس طرح وابستہ ہے کہ اگر اُن کو اقلیت کا مرتبہ دیکر غیر اہم سمجھا گیا تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہوگی۔

بہرحال اگر جدید اصلاحات کی رو سے ہندوؤں کو نصف نمایندگی دی گئی ہے تو میں اسے انصاف سے زیادہ "عطا و کرم" سمجھتا ہوں، جس پر انھیں حکومت سرکار عالی کا بیش از بیش شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

مہاسبھائی اور آریہ سماجی حلقوں میں اصلاحات کا خیر مقدم اس خوشدلی کے ساتھ نہیں کیا گیا جس کی

توقع تھی اور اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وہ ان اصلاحات کو اپنی شورش کا نتیجہ سمجھتے ہوں، لیکن ان کا ایسا سمجھنا سخت غلطی ہوگی کیونکہ اصلاحات کا سوال آریہ سماجی شورش سے بہت پہلے سر علی امام ہی کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا اور کمیٹی اصلاحات کا قیام اب سے دو سال قبل ہی ہو چکا تھا اس لئے اصلاحات کا نفاذ کوئی سودا نہیں ہے جو حیدر آباد کی حکومت نے ہندوؤں یا آریہ سماجیوں سے کیا ہو، بلکہ نتیجہ ہے حکومت سرکار عالی کی ترقی پسند پالیسی کا اور اعلیٰحضرت کی اس فطرت فیاض کا جس نے ملک کی فلاح اور رعایا کے جذبات کا لحاظ رکھنے میں ہمیشہ غیر معمولی دریا دلی سے کام لیا ہے ۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں حیدر آباد ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اکثریت و اقلیت کے درمیان کبھی کوئی نزاع پیدا نہیں ہوئی اور مذہبی رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہندو، سکھ، عیسائی، سب کی عبادتگاہوں کے لئے جایدادیں وقف ہیں ۔ اقتصادی حیثیت سے وہاں کی اکثریت اتنی خوشحال و متمول ہے کہ اگر تمام ملازمتیں صرف مسلم اقلیت کے لئے مخصوص کردی جائیں تو بھی ہندوؤں کا پلہ بھاری رہے گا ۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب سے قبل جب ہندوؤں کی نمایندگی وہاں نہ ہونے کے برابر تھی ان کی اقتصادی حالت کیوں اچھی تھی اور اب کہ ان کی نمایندگی نصف ہوگئی ہے ان کو کیا اندیشہ نقصان کا ہو سکتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ خود حیدر آباد کی ہندو آبادی کو کبھی بھی حکومت کی طرف سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور اس لئے وہ جدید اصلاحات کو انتہائی مسرت سے قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوگی، رہ گئی بیرونی تحریک سو اس کا اثر نہ پہلے حکومت نے لیا اور نہ آیندہ وہ اس کی پرواہ کر سکتی ہے ۔

اب رہ گیا حیدر آباد کے مسلمانوں کا اختلاف سو وہ اور زیادہ حیرت انگیز ہے ۔ اُن کے اختلاف کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک یہ کہ وہ اصلاحات کو حکومت کی کمزوری اور شہریار دکن کی کمی اقتدار پر محمول کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی نصف نمایندگی کو وہ اپنے حقوق ملازمت کا غصب سمجھتے ہیں ۔ لیکن میری رائے میں دونوں باتیں غلط ہیں ۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ کس دور سے گزر رہے ہیں، ہوا کا رُخ کیا ہے ۔ دنیا سے شخصی حکومتیں مٹ رہی ہیں ذاتی وجاہتیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ جمہوریت و دستوریت نہیں بلکہ اشتراکیت لیتی جا رہی ہے ۔ یہ وقت گھر میں بیٹھکر اس طوفان سے محفوظ رہنے کا ہے نہ دامن بچا کر گزر جانے کا، بلکہ اپنے آپ کو اس میں ڈالدینے اور ہاتھ پاؤں مار کر ساحل تک پہونچنے کا ہے ۔

حیدر آباد کوئی معمولی ریاست نہیں ہے بلکہ ایک ملک ہے جس کی وسعت و آبادی یوروپ کی بعض خود مختار حکومتوں سے بھی زیادہ ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ کرۂ ارض کے کسی خطۂ مجہول کی طرح اپنے آپ کو دنیا سے علٰحدہ رکھے اور موجودہ بین الاقوامی تمدن و تجارت، صنعت و حرفت کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد رکھ سکے

اسے زندہ رہنا ہے اور انھیں خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنا ہے جو صف اولین کے ترقی یافتہ ممالک کے لئے ضروری ہیں۔ وہاں کی حکومت دُنیا سے بیگانہ ہو کر کوئی امتیاز حاصل نہیں کر سکتی، وہ ایک مستبد حکومت ہونے کا داغ اپنی پیشانی پر نہیں لگا سکتی، اسے تمام امتیازات سے بلند ہو کر حکومت کا اعلیٰ معیار قایم کرنا ہے اور ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھ کر یہ ثابت کرنا ہے کہ بادشاہ کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا اور اس کی نگاہ میں رعایا کا ہر ہر فرد یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اگر وہاں اصلاحات کا نفاذ ہو رہا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اعلحضرت کا اقتدار کم ہو رہا ہے بلکہ اس سے ان کے اقتدار میں وہ اضافہ ہو رہا ہے جو دنیا میں صرف ایک بلند نظر، بلند حوصلہ رکھنے والے فرمانروا ہی کا حصہ ہوا کرتا ہے۔

یہ اصلاحات شہریارِ دکن کی عطا کردہ ہیں اور ان کو ہر وقت اختیار حاصل ہے جب چاہیں انھیں واپس لے لیں، اصلاحات اُن سے وجود میں آئی ہیں، ان کی ذات شاہانہ اصلاحات کی پابند و محتاج نہیں ہے، اسلئے اصلاحات کو اعلحضرت کے اقتدار کے منافی سمجھنا گویا انھیں مجبور سمجھ لینا ہے جو اعلحضرت کے ساتھ محبت و وفاداری نہیں بلکہ اُن کی بلند شخصیت کی توہین ہے۔

مسلمانوں کو ایک انسان کی حیثیت سے صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اصلاحات ملک کے لئے مفید ہیں یا نہیں، یعنی ان سے وہاں کی عام اقتصادی و ذہنی ترقی پر اچھا اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے (جس سے انکار ممکن نہیں) تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ انھیں اس آبادی کے حقوق پامال کرنے کا کیا حق حاصل ہے جس کی تعداد وہاں ۸۵ فی صدی ہے، کیا اسلامی حکومت کا معیار حیدرآباد کے مسلمانوں نے اتنا پست کر دیا ہے اور کیا ان کے نزدیک حریت و مساوات بانی اسلام کی سب سے پہلی آواز نہ تھی۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام، نازیت، وفسطائیت نہیں ہے کہ وہ ذاتی خود غرضی پر سارے دنیا کی قربانی چڑھا دے، اسلام نے اکاسرۂ عجم کی سلطنتیں اس لئے نہیں مٹائی تھیں کہ دُنیا میں پھر کسریٰ پیدا ہوں، اس نے "لکم دینکم ولی دین"، کا اعلان اس لئے نہیں کیا تھا کہ غیر مسلم قوموں کے حقوق پامال کر کے مسلمان سرمایہ داری کی بنیاد ڈالیں۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہاں کی مجلس اتحاد المسلمین کا صدر جو اپنے آپ کو بڑا باخبر انسان سمجھتا ہے، ان اصلاحات کو "شاہ ذیجاہ کے اقتدارات رعایا میں منتقل ہو جانا"، کہتا ہے اور حکومت کو ڈراتا ہے کہ اگر ان اصلاحات کا نفاذ ہوا تو مسلمان تعاون نہ کریں گے۔ درانحالیکہ وہ خود ہی یہ کہکر اعلحضرت کے اقتدار کو صدمہ پہونچانا چاہتا ہے اور حکومت کو مجبور کرتا ہے کہ اپنا اقتدار تسلیم کرانے کے لئے سب سے پہلے اس آواز کو بند کر دے۔

میں سمجھتا ہوں کہ "ذات شاہانہ"، کا بار بار ذکر تو صرف بہانہ ہے ورنہ وہاں کے مسلمانوں کا اصل مقصود اپنی اُن کمزوریوں کو چھپانا ہے جن کو اصلاحات کے نفاذ کے بعد وہ چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

وہاں کے مسلمان تقریباً سب کے سب ملازمت پیشہ ہیں، اور چونکہ اصلاحات کی رو سے صرف اہلیت وقابلیت کو معیار ملازمت قرار دیا گیا ہے اس لئے وہ ڈرتے ہیں کہ اس امتحان مسابقت میں ہندوؤں سے بازی نہ لیجا سکیں گے اور نوکریوں سے محروم ہو جائیں گے۔ پھر اگر وہاں کے مسلمان واقعی اتنے ہی تنگ نظر و تنگ حوصلہ ہیں تو یقیناً نہ ایسی جماعت کا تعاون کسی حکومت کے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے اور نہ ایسے ناکارہ غلاموں کی جماعت اقتدار شاہانہ کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ان میں واقعی غیرت و خودداری پائی جاتی ہے اور وہ محنت سے جی نہیں چراتے تو پھر انھیں کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہئے جبکہ اصلاحات میں ہندوؤں کے لئے ۵۰ فی صدی ملازمتوں کی بھی تخصیص نہیں ہے اور بہت سے ایسے انتظامات جن سے مسلمانوں کا مفاد اور خود ذات شاہانہ کا اقتدار براہ راست متعلق ہو سکتا ہے، اعلیٰحضرت ہی کے ہاتھ میں ہیں اور مجلس مقننہ یا مشاورتی کمیٹیوں کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، وہاں کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ اگر اصلاحات واقعی ان کے نقطۂ نظر سے مضرت رساں ہیں، تو بھی ان کا نفاذ تو اب کسی طرح ملتوی نہیں ہو سکتا اور اگر ملتوی ہو جائے تو اس سے زیادہ سبکی حکومت کی کوئی اور نہیں ہو سکتی، اس لئے اب مصلحت و عقل کا اقتضاء یہ ہے کہ اصلاحات پر کاربند ہو کر عملاً اس کے مفید یا غیر مفید ہونے کا تجربہ کیا جائے اور بعد کو جو جو صورتیں نقصان و مضرت کی پائی جائیں رفتہ رفتہ انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ان کی موجودہ شورش حد درجہ سفیہانہ و غیر سنجیدہ حرکت ہے۔ کیونکہ اگر انھوں نے تعاون نہ کیا (حالانکہ یہ ممکن نہیں) تو بھی اس سے نہ حکومت کو کوئی نقصان پہونچ سکتا ہے نہ اصلاحات کو۔ اگر انھوں نے مجالس مقننہ میں کوئی حصہ نہ لیا تو سرکاری نامزدگی سے اس کمی کو بہ آسانی پورا کیا جا سکتا ہے اور اگر ملازمتیں ترک کر دیں تو بھی ان کی جگہ بہ آسانی پر ہو سکتی ہے۔ رہا گیا ہنگامہ و فساد، سو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ جب کبھی بقاءِ حکومت و اقتدار کا سوال سامنے آگیا تو بیٹے نے باپ کو قید کرنے میں بھی تامل نہیں کیا اور بھائی کا بھائی کو قتل کر دینا بھی تاریخ اسلام ہی کا واقعہ ہے، رعایا کا کیا ذکر ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ رائٹر نے ۲۸ جولائی کے ہندو مسلم تصادم کی خبر سنائی اور اسی کے ساتھ اس فرمان کے نفاذ کی کہ آئندہ وہاں اصلاحات کے خلاف مسلمانوں کے مظاہرہ کو خلاف قانون قرار دیکر بند کر دیا گیا ہے اور ایسے مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ انجمن اتحاد المسلمین قانون شکنی کی کیا صورت اختیار کرتی ہے اور اس کے صدر اپنے ادعا کے موافق جیل جانے میں تقدیم کرتے ہیں یا نہیں۔

اُردو غزل گوئی

اور

حضرت عبدالمنان بیدل عظیم آبادی

اس صحبت میں مجھے حضرت بیدل عظیم آبادی کی غزل گوئی پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ہے۔ مگر سے قبل میں اُن اعتراضات کا جو غزل گوئی پر کئے گئے ہیں جواب دینا چاہتا ہوں تاکہ صاحب نظر حضرات میرے نقطۂ نظر سے واقف ہو جانے کے بعد جناب بیدل عظیم آبادی کی غزل گوئی کے متعلق رائے قایم کریں۔

اُردو غزل گوئی کی مخالفت اور موافقت میں زمانۂ حال و ماضی میں بہت سے مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اُن سب پر تبصرہ کرنا میرے دائرۂ گفتگو سے خارج ہے۔ مگر میں جناب عندلیب شادانی کے اعتراضات کو پیش نظر رکھکر غزل گوئی کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کی تشریح کروں گا۔ میں نے جناب عندلیب کو اس وجہ سے معترضین کے نمایندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے کہ اُن کے مقالوں کے خندہ آفریں انداز نے بالغ نظرانہ نقد و بصر کو بہت کافی صدمہ پہونچایا ہے۔ جناب عندلیب کے موقر و سر برآوردہ رسالہ ساقی (دہلی) میں شایع شدہ مضامین کے اندر صداقت کے ساتھ ساتھ سچائی پر پردہ ڈالنے والا مضحکہ بھی ہے، میں صداقت کا اعتراف کرتے ہوئے فنی نقطۂ نظر سے اُن مضحکوں کا جواب دونگا جنھوں نے صناعت (Art) اور فن انتقاد کو مجروح کیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُردو غزل گوئی کی دنیا میں عام طور پر جمود اور فرسودگی کا دور دورہ ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ فن بذاتہ فرسودہ اور منجمد ہے۔ اور ہر چند کہ ہمارے بیشتر شعراء پرانی لکیر کے فقیر ہیں تاہم اس ہجوم میں وہ سربلند ہستیاں بھی، نظر آتی ہیں جن پر شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ ہمارے محترم نقاد جناب عندلیب شادانی نے انھیں سر برآوردہ ہستیوں کو نشانۂ طعن و تضحیک بنایا ہے۔ بے شک ان اساتذہ کے کلام میں غلطیاں پائی جا سکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا کلام شہ پارۂ شاعری ہے۔ چند اشعار کو چن لینا اور بات ہے اور مکمل طور پر اُن کا جایزہ لینا دوسری چیز ہے۔ اسی نوع کے نقادوں نے شیلے اور کیٹس کی شاعری میں غلطیاں نکالی

تھیں اور بلاشبہ ان کی شاعری میں خامیاں ہیں۔ پھر بھی باوجود خامیوں کے ان کی شاعری انگریزی ادب کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں اس قسم کی انفرادی غلطیوں سے بحث نہیں کروں گا بلکہ میرے زیر غور اصولی باتیں ہوں گی۔

جہاں تک صنفِ غزل گوئی کا تعلق ہے یہ امر مسلّم ہے کہ ادب عالم میں ایسے مرصع ایجاز بلیغ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ منفرد فن مشرقِ قریب کے لئے مخصوص ہے۔ غزل مختصر تصویر دل (Miniature painting) کا ایک خوبصورت نگار خانہ ہے۔ محمد حسین ادیب مرحوم نے غزل کو ادبی میناکاری سے تشبیہ دی ہے۔ غزل پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں تسلسل اور منطقی ارتقا نہیں ہوتا۔ یہ مجھے تسلیم ہے۔ مگر اس خصوصیت کو نقص کیوں کہئے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ چونکہ یوروپ کی عام شاعری میں تسلسل پایا جاتا ہے ہماری شاعری کی ہر نوع میں یہ خصوصیت پائی جائے غزل شاعری کی ایک منفرد شکل (Form) ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک مخصوص ترکیب (Technique) کو برتا جاتا ہے۔ اگر یہ خاص ترکیب دوسری ترکیبوں سے نہیں ملتی تو کیا حرج ہے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ اس ترکیب سے حسن کاری اور مسرت آفرینی کو صدمہ تو نہیں پہونچتا۔

حسن کاری اور مسرت آفرینی کا فیصلہ کرنے کے لئے دو معیاروں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلا معیار ماحول کی عام پسندیدگی کا معیار ہے اور دوسرا بین الملی انسانی معیار۔ ماحول کی عام پسندیدگی پر ملی خصوصیات آب وہوا ذوق اور میلان، ادبی رجحانات کا اثر پڑتا ہے۔ مختلف قوموں کو مختلف چیزیں حسین معلوم ہوتی ہیں اور انھیں مختلف اور اکثر متضاد چیزیں مسرور کرتی ہیں۔ کسی فن کو لے لیجئے مثلاً مصوری، اداکاری، شاعری، موسیقی، فن تعمیر وغیرہ ان میں سے ہر ایک دور دور بسنے والی قوموں میں مختلف ہے۔ یورپ کی موسیقی ہندوستانیوں کو نہیں بھاتی یا کم از کم اپنی قومی موسیقی سے کم بھاتی ہے۔ یونانی مصوری، مصری اور جاپانی نقاشی سے مختلف ہے۔ جاپان کے قومی ڈرامے، اس کی طرز اداکاری اُس کے اسٹیج کی قسم آج بھی یورپ کے اسٹیج اس کی اداکاری اور اسکے ڈراموں سے مختلف ہیں۔ راجپوتانہ اور دکن کے مندر، سکندرا، فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی کی عمارتوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ گوتھک اور چینی طرز تعمیر میں نمایاں فرق ہے۔ غرض زمان و مکان کا فرق ذوق و میلان پر اثر ڈالتا ہے۔ صناعی کی حسن کاری اور مسرت آفرینی اضافی چیزیں ہیں۔ اس لحاظ سے غزل گوئی اپنا فنی مقصد پورا کرتی رہی ہے اور اب بھی کرتی ہے۔ ہم لوگ اپنی روایات سے ابھی تک زیادہ دور نہیں ہوئے۔ ہمارا مذاق ابھی زیادہ نہیں بدلا ہے، یہاں تک کہ ہم نظموں میں بھی شان تغزل ڈھونڈتے ہیں۔ ہم لوگ مثنوی، مسدس، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کے تسلسل اور منطقی ارتقا کے ساتھ ساتھ غزل کی خاص قسم کی تعمیر کو بھی پسند کرتے ہیں۔

حسن کاری اور مسرت آفرینی کا دوسرا معیار بین الملی ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک یا کسی زمانہ کی صناعت دوسرے ملک اور زمانہ کے لوگوں کو بھی اپنے اُن اجزائے حسن کی وجہ سے جو آفاق گیر (Universal) ہوں مرغوب ہو تو

وہ صناعت دوسرے معیار پر بھی پوری اُترے گی - ایسی صناعت جو دونوں معیاروں پر پوری اُترے آفاق گیر اور غیر فانی ہوتی ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کے اندر وہ اجزائے حُسن پائے جاتے ہیں یا نہیں، جو آفاق گیر اور غیر فانی ہوں -

میرا خیال ہے کہ غزل کے اندر ایسے اجزار پائے جاتے ہیں - جس طرح گوتھک، رومی، یونانی، مصری، قدیم ہندی، عربی اور مغل عمارتیں اپنے اُن جلووں کی وجہ سے جو انسانیت عظمیٰ کو متاثر کرتی ہیں زندہ و پائندہ ہیں، اسی طرح غزل گوئی کا فن بھی غیر فانی ہے، آیئے اس کا نفسی تجزیہ کیا جائے -

غزل پر یہ اعتراض ہوتا ہے نہ کہ اس میں تسلسل اور منطقی ارتقا نہیں - یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے دماغ میں جو خیالات تحت الشعوری طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں اُن میں کوئی ترتیب و تسلسل نہیں ہوتا نہ اُن خیالات میں منطقی ارتقا پایا جاتا ہے - غزل گو اپنے دل کے اندر محبوب سے گفتگو کرتا ہے، اُس کے بارے میں، اپنے بارے میں اور محبت کے متعلق سوچتا ہے - غزل نہایت ہی لطیف محسوسات کی تصویر ہوتی ہے پیچ در پیچ جذبات، نوع در نوع محسوسات، انمل واردات، رنگا رنگ تخیلات کی آئینہ سامانی ایک ایسی قسم کی صناعت (Art) سے ممکن تھی جس میں داخلی کیفیتوں سے ہم آہنگ خارجی طرزِ اظہار (Method of expression) اختیار کی جائے - غزل کی "ٹکنیک" اس کے مضامین کے لحاظ سے نہایت ہی موزوں و مناسب ہے - غزل شعور اور تحت الشعور کی آویزشوں کی مصوری بھی کرتی ہے اور یہ آویزشیں منظم طور پر نہیں ہوتیں - غرض غزل کی شکل اور اس کے معنی میں ہم آہنگی ہے - غزل بلند آواز میں فکر و خیال سے غزل نفسی موجوں (Psychic waves) کے خاموش تلاطم کو قابلِ سماعت بنا دیتی ہے - لہذا غزل کی "ٹکنیک" میں بھی تلاطم اور مد و جزر ہوتا ہے - غزل کی ظاہرا بد ترتیبی میں ایک ترتیب ہے - اس کے بے ربط پن میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے - اس کی جنون سامانی میں بھی ایک سلیقہ ہے (Method in madness) اس لحاظ سے غزل ایک نہایت ہی کامیاب صناعت ہے - انسان اس آئینے میں اپنے دماغ کی تصویر دیکھ لیتا ہے داخلی کیفیات اور خارجی شکل میں ہم آہنگی کے سبب اس نوعِ صناعت میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے - ہم آہنگی اور توازن (Harmony + balance) آفاق گیر معیارِ حُسن ہے - غزل کی ہم آہنگی، داخل اور خارج کی ہم آہنگی ہے - لہذا فنِ غزل مسرت آفریں ہے - مسرت آفرینی کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ غزل داخلی واردات کی ترجمانی کرتے ہوئے رازہائے سربستہ سے پردہ اُٹھاتی ہے اور راز جوئی دلچسپ مشغلۂ انسانی ہے انسان ان دیکھی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے اور اس تلاش و جستجو اور تکمیل تمنا میں مسرت کا سامان پاتا ہے - خارجی حقیقت نگاری کے وقت بھی غزل گو اپنے داخلی تاثرات کا اظہار کرتا ہے - غرض فنِ غزل مقامی اور

آفاق گیر ہر دو معیاروں پر پورا اُترتا ہے، لہٰذا کامیاب اور صحیح غزل گوئی نہایت ہی جمیل و لطیف صناعت ہے۔

ہمارے مغرب زدہ نقاد اُسوقت تک قایل نہیں ہو سکتے جب تک مغربی ادب کی چند مثالیں نہ پیش کر دیجائیں سرِ راہے میں یہ خدمت بھی انجام دے ہی دوں۔ انگریزی داں حضرات براؤننگ (Browning) سے واقف ہونگے علامہ اقبال مرحوم نے بھی عہدِ وکٹوریہ کے اس عظیم ترین شاعر کی توصیف کی ہے اور دورِ جدید کے ایک موقر ادیب و نقاد چسٹرٹن نے اس شاعرِ اعظم کی بے حد مدح کی ہے اور اس کی شاعری کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے ایک بسیط کتاب لکھی ہے۔ براؤننگ کے "وحدانیے" (Monologues) نفسی واردات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان وحدانیوں میں معروف ترتیب و تسلسل نہیں پایا جاتا۔ براؤننگ کا آرٹ مشرقی غزل گوئی سے مشابہت رکھتا ہے ایک فرانسیسی نقاد لکھتا ہے:-

"The uninterrupted brooding of our dimmer mental life is rendered through the medium best fitted for that task — the monologue, which from the time of Robert Browning had been drawing nearer to the immediate intuitive elements of thought. The inextricable network of reality, the chaos of human experience are represented by a series of episodes, not connected logically and yet convincing"

(Translation from Louis Cazamian)

(ترجمہ) "ہماری نسبتاً مبہم ذہنی زندگی کی مسلسل غور و فکر کا اظہار وحدانیہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو اس مقصد کے حصول کے لئے بہترین واسطہ ہے اور جو رابرٹ براؤننگ کے وقت سے قریبی وجدانی عناصرِ خیال سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت کا عقدۂ لاینحل اور انتشارِ تجربات انسانی ایک منطقی طور پر نامربوط اور اس کے باوجود اثر خیز و معقول سلسلۂ واقعات کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں۔" (لوئس کزامیان)

براؤننگ کے علاوہ عصرِ جدید کا ایک ناول نگار (James Joyce) بھی اسی نوع کی صناعت پیش کرتا ہے یہ بھی روح کی پوشیدہ زندگی کی تصویر کشی حسن کاری کے ایک جدید قانون کے ماتحت کرتا ہے جو ظاہرا بے آئینی معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہ تحت الشعوری واردات کی تمثیل کے لئے نہایت ہی مناسب طریقہ ہے۔ جیمس جوائس کی تخلیقی قوت کا ایک زمانہ معترف ہے

براؤننگ اور جیمس جوآئس کی صناعت سے ہماری صناعتِ غزل بہت ہی قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ آیندہ صنعتِ غزل پر اعتراض کرنے والے ذرا وسیع النظری سے کام لیں۔

اب دوسری بات سنئے، شاعری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تجربے کی شاعری (Poetry of experience) اور دوسرے تخیل کی شاعری (Poetry of imagination) یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ شاعر جو کچھ کہے وہ خالص مادی تجربہ کی بات ہی ہو۔ جگ بیتی اور آپ بیتی کے علاوہ بعض ایسے واردات بھی ہوتے ہیں جن کا تجربہ مادی نہیں بلکہ وجدانی، ذہنی اور تخئیلی طور پر ہوتا ہے۔ ادب عالم میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ گوئٹے کا فاوسٹ شکسپیر کے رومانی ڈرامے، ملٹن کی "فردوسِ گمشدہ" ڈانٹے کا "جہنم" کالیداس کے اکثر ڈرامے مثلاً "وکرم اُروسی" وغیرہ وجدانی اور تخئیلی شاعری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ جو غزل گوئی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر ظن و قیاس کی باتیں ہوتی ہیں اور شعراء اپنے تجربات پیش نہیں کرتے، قابل اعتنا نہیں۔ یوں تو اُردو غزل میں خالص تجربہ کی شاعری بھی بہ کثرت ملے گی لیکن جہاں تجربہ نہیں وہاں تخیل کا رنگ ہے۔ تخیل بھی تجربہ کی ایک شکل ہے لہٰذا تخئیلی شاعری صداقت سے دور نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر جگہ ماہرین فن کے ساتھ ناتجربہ کاروں اور گمراہوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے لیکن اس سے فن کو کوئی اُصولی صدمہ نہیں پہونچتا۔

جناب عندلیب نے حسرت، فانی، اصغر اور جگر پر اعتراض کرنے سے پہلے اُردو غزل گوئی کا دلچسپ تجزیہ کیا ہے۔ ایک ماہر قصاب کی طرح انھوں نے غزل کی بوٹیاں بوٹیاں علٰحدہ کی ہیں اور اجزاء کی قسموں کے لحاظ سے ٹکڑوں کے الگ الگ ڈھیر بھی لگائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"اب ہم اُن مضامین کی ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جو ابتدا سے اس وقت تک ہر دور کے شعراء میں مقبول رہے ہیں۔ اور جن کی بنا پر ہم عصر حاضر کے چوٹی کے غزل گو شعراء کو بھی نقال اور کہنہ پرست کہنے پر مجبور ہیں (۱) پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، قتل و خون۔ (۲) نزع، مرگ، صبر، حشر۔ (۳) میکشی۔ (۴) زاہد، واعظ، محتسب ناصح۔ (۵) جفائے محبوب۔ (۶) تصوف و فلسفہ۔ (۷) اشکِ خونیں۔ (۸) جنون۔ (۹) آفتاب و ذرہ، دریا و قطرہ، دل و جگر، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں۔ (۱۰) ہوائی محل"۔ (از ساقی اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء۔ عندلیب شادانی)

اس میں کس کافر کو شک ہے کہ پیکان و تیر، جفائے محبوب، آفتاب و ذرہ، شمع و پروانہ وغیرہ کے مضامین رسمی انداز اور تقلیدی اسلوب سے بہت باندھے گئے ہیں اور اسی گناہ کے مرتکب اساتذہ بھی ہوئے ہیں، لیکن اکثر کاملین فن نے اسی مواد سے نئی نئی باتیں بھی پیدا کی ہیں۔ انھیں عناصر سے انھوں نے نوع بہ نوع صورتیں بھی بنائی ہیں۔

ہر صناعت اپنے لئے اظہار کا کوئی مخصوص واسطہ (Medium of expression

منتخب کرتی ہے۔ منتخب کئے ہوئے واسطۂ اظہار کے ذریعہ صناعت اپنا پیغام پہونچاتی ہے۔ اس واسطے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور ان شکلوں کے متعدد ارکان ہوتے ہیں۔ فنِ تعمیر کو لیجئے۔ دیکھئے مغل فنکاروں نے سنگ مرمر اور سنگ سرخ کو صناعت کے واسطے کے طور پر چنا اور اس واسطے کو ایک خاص شکل بخشی جو اپنی انفرادی خصوصیات کے سبب دوسری تعمیری شکلوں سے ممیز کی جاتی ہے۔ اگر آپ مغل عمارتوں کا تجزیہ کیجئے تو وہ ارکان آپ کو نظر آئیں گے جو اس طرزِ تعمیر کے عناصر ہیں۔ مثلاً

(۱) خاص اُٹھان کی محرابیں۔ (۲) خاص اُٹھان کے مینار۔ (۳) خاص اُٹھان کے گنبد۔ (۴) چبوترے (۵) جھروکے (۶) دروازے۔ (۷) گل تراشی۔ (۸) سنگ تراشی (پتھر میں جال بنانا) وغیرہ وغیرہ۔

یہی عناصر آپ کو کم و بیش ہر مغل عمارت میں نظر آئیں گے تو کیا ان عمارتوں پر فرسودگی اور کہنگی کا الزام لگایا جائے گا۔ دوسرے دبستانِ تعمیر میں بھی مخصوص ارکان پائے جاتے ہیں۔ موسیقی، مصوری وغیرہ سے بھی بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی اگر اردو کے غزل گو بھی اپنی صناعت کے ارکان مقررہ کی پیروی کرتے ہیں تو کیا قباحت پیدا ہوتی ہے ہاں یہ تو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان ارکان کو فرسودہ طریقے سے بھی استعمال کیا گیا ہے اور کسی قسم کی جدت کا لحاظ نہیں رکھا گیا لیکن اس کے برخلاف ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اسی مواد سے نئی صورتیں بھی بنائی گئی ہیں۔

جدت دو قسم کی ہوتی ہے (Originatity)۔ نئی چیز اور نئی بات کی تخلیق ایک نوع کی جدت ہے اور نئی تعبیر دوسری قسم کی جدت (Creation & interpretation) پہلے قسم کی جدت بہت ہی نادر الوجود ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس عالم میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں۔ دوسری نوع کی جدت دنیائے ادب و فن میں زیادہ نظر آتی ہے۔ نئی تعبیر بھی بہت ہی بڑا کارنامۂ تخلیق ہے۔ پرانے مواد کو جدید طریقہ سے پیش کرنا بھی بڑی بات ہے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اصغر، جگر، فانی، یاس اور حسرت میں رسمیت کے پہلو بہ پہلو جدت بھی نظر آئے گی۔ یہ اساتذۂ غزل کے عناصر کہنہ سے تغزل جدید کا وجود نو پیدا کرتے ہیں۔ انھیں پرانے ارکان کی نئی ترکیب و تحلیل (Synthesis) سے خیال کے نئے بتکدے طیار ہوتے ہیں۔ ان اساتذہ نے پرانے اصنام خیالی کے ساتھ ساتھ بتانِ نو بھی تراشے ہیں اور ان فنکاروں نے عناصرِ غزل کی مختلف ترکیب سے اپنی اپنی صناعت کی انفرادیت بھی پیدا کی ہے اصغر کا آرٹ فانی سے مختلف ہے اور حسرت کا جگر سے۔

غزل ایک نہایت ہی مختص صناعت (Specialised art) ہے اور اسکی اپنی اصطلاحیں

علٰحدہ ہیں۔ غزل گو شعراء ہمیشہ اپنی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور صناعتِ غزل کے ارکانِ مقررہ سے اپنے فن کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ تجزیہ کے بعد تاج محل میں وہ کیا بات رہ جاتی ہے جو دوسری مغل عمارتوں میں نہیں ؟ کسی پارۂ فن کی خصوصیت تجزیہ (Analysis) سے نہیں بلکہ ارکان و عناصر کی جدید انفرادی ترکیب و تحلیل (Synthesis) سے ظاہر ہوتی ہے۔

کسی چیز کا اگر تجزیہ کر کے چھوڑ دیا جائے تو مضحکہ ضرور پیدا ہو سکتا ہے لیکن صحیح نقد و بصر کے لئے مجموعی شکل و صورت کی خصوصیات کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ کسی حسین سے حسین عورت کے ناک، کان کاٹ کر علٰحدہ علٰحدہ دیکھئے تو صرف ناک کان ہی نظر آئیں گے حُسن نظر نہیں آئے گا۔ دیے رحمانہ تجزیہ کے بعد ہیرے میں بھی وہی عنصر نظر آئیگا جو کوئلے میں ہے یعنی کاربن۔

ناقد مدّاح نہیں مبصر ہوتا ہے لیکن مضحک بھی نہیں ہوتا۔ یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یاس عظیم آبادی، اصغر، حسرت فانی اور جگر کے یہاں فن کے پُرانے نمونے بھی ملتے ہیں لیکن یہ اساتذہ اُن نمونوں کی وجہ سے گلہائے سرسبد نہیں ہوئے ان کی بزرگی و جدت ان کے کلام کے اُس حصے سے وابستہ ہیں جس میں یہ فنکار ارکانِ قدیم کی جدید ترکیب پیش کرتے ہیں۔ جناب عندلیب نے صرف ایسے اشعار چنے ہیں جن میں پرانا رنگ چوکھا ہے اور اسی فرسودہ طرز کا انھوں نے مذاق اُڑایا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اساتذہ کے کلام میں جدید رنگ کے اشعار نسبتاً کم ہوں لیکن اس قلت کی وجہ سے اُن کی عظمت میں فرق نہیں آتا کیونکہ اُن کا زمانہ اُردو شاعری کا دورِ تداخل (Transitory period) تھا۔ یہ اساتذہ پرانی روایات کی گود میں پلے تھے۔ پرانے چمن میں نئے گُل کھلانا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ روایات سے کمل قطع تعلق تو بہر حال ادب کے لئے مہلک ہوتا ہے لیکن اگر صرف روایات ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے تو وہ اور زیادہ قاتل ہے۔ میں ایسے غزل گو حضرات کو جو روایات کو بلوغتِ ادب کے بعد بھی شیر مادر سمجھتے ہیں، عجائب خانہ کی زینت کا سامان خیال کرتا ہوں لیکن روایات کو یکسر فراموش کرنے والوں کو بھی میں آق کی ہوئی آوارہ و رسوا اولاد سمجھتا ہوں۔ شیلے جیسا باغی بھی "ریوولٹ آف اسلام" کی تمہید میں روایات کی اہمیت تسلیم کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں (T. S. Elliot) ٹی۔ اس۔ ایلیٹ نے روایات کی اہمیت کے متعلق بہت سے مقالے لکھے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اساتذۂ غزل محض لکیر کے فقیر نہیں۔ انھوں نے پرانے سنگ و گل سے نئے اصنام بھی بنالئے ہیں۔ ہر چند کہ نئے بتوں کی تعداد کم ہے لیکن جو کچھ ہے وہ شہکارِ فن ہے۔ میر کی میری اور غالب کا غلبہ بھی کتنے اشعار کے دوش پر قایم ہے ؟ شیکسپیر کے ڈرامے بھی روایات کہنہ کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں کتنے ڈرامے ہیں جو شیکسپیر کو شیکسپیر بناتے ہیں ؟۔

جناب شادانی نے بہت سی سچی باتیں بھی لکھی ہیں لیکن وہ اسی طرح کا سچ ہے جو کسی شخص کی تصویر میں

نہیں بلکہ اس کے سوانگ (Caricature) میں پایا جاتا ہے - شادانی صاحب نے ایک رجحان کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے - آپ نے کارٹونوں میں دیکھا ہوگا کہ کسی ایک خصوصیت کو اس یک رُخی مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ مشابہت تو قایم رہتی ہے لیکن حقیقت پر پردہ پڑ جاتا ہے - شادانی صاحب نقاد و مبصر ثابت نہیں ہوئے بلکہ ایک کامیاب کارٹونسٹ - وہ سوانگ اچھا بھر سکتے ہیں - جناب نے اصغر، حسرت، جگر اور فانی کا کیریکیچر پیش کیا ہے -

جناب شادانی نے "اشکِ خونیں" کے متعلق کئی صفحے سیاہ کئے ہیں - آپ کو اشکِ خونیں کی غیر فطریت بہت ہی چراغ پا کرتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادانی صاحب بڑے ترنگ میں تھے - اسی من کی موج میں انھوں نے اساتذہ کی نقلیں کیں اور ان کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا - اُس وقت اُن پر ایک پی - ایچ - ڈی کی سنجیدگی طاری نہیں تھی - مزے میں جو آئے تو پھر جایز و ناجایز سبھی کا مذاق اُڑایا - جناب ایسے بدمذاق تو ہرگز نہیں کہ استعارہ کی لطافت کو نہ سمجھیں لیکن جب سمجھنا نہ چاہیں تو اس نشہ کو کون اُتارے - شادانی صاحب "اشکِ خونیں" کو روتے ہیں شیلے (Shelley) کہتا ہے :-

"The agony and bloody sweat"

اشک شدتِ گریہ سے خونیں بن بھی سکتا ہے لیکن پسینے کو خونیں بنانے کے لئے تو برسوں عرق ریزی کرنی پڑے گی -

ناظرینِ کرام نے یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ مجھے جناب عندلیب شادانی سے اس لئے اختلاف ہے کہ انھوں نے نیم صادق باتیں بیان کی ہیں اور جو طرز انھوں نے اختیار کیا ہے وہ خندہ آفریں تو ہے لیکن خیال پرور نہیں - نیز میں نے غزل کی صناعت پر اصولی رنگ میں روشنی ڈالی ہے - اب آیئے میں جناب عبدالمنان صاحب بیدل عظیم آبادی کی غزل گوئی سے آپ کو متعرف کروں -

صوبہ بہار اُردو ادب و شاعری کی بہت ہی پرانی تاریخ رکھتا ہے - نثر کی قدامت کے لحاظ سے بہار دکن کے بعد ہی آتا ہے - بہار کا تعلق اُردو شاعری سے بھی نہایت ہی قدیم ہے - ابتدائی دور کو چھوڑ کر میں متقدمین سے ابتدا کرتا ہوں -

میر دہلوی کے ہم عصر راسخ عظیم آبادی اُردو غزل اور مثنوی کے بہت بڑے علمبردار تھے - آپ کا رنگ شاعری میر سے ملتا جلتا تھا - جناب میر راسخ کی عظمت کے قایل تھے - راسخ کو صوبہ بہار کا میر سمجھنا چاہئے - راسخ کے زمانہ میں اور انکے زمانہ کے بعد بھی بہار میں بہت سے اُردو شعرا ہوئے جن میں جوشش عظیم آبادی کا نام مشہور ہے - متاخرین میں صفیر بلگرامی، شوق نیموی اور شاد عظیم آبادی فخر بہار ہوئے ہیں - اس سلسلہ میں عرش گیاوی اور اختر عظیم آبادی کے نام بھی زینتِ فہرست ہیں - پرانے لوگوں میں تمنا پھلواروی، شفق عماد پوری اور فضل حق آزاد ابھی تک رونقِ بہار ہیں -

ہر چند کہ بہار کی شاعری پر اواخر میں لکھنؤ اسکول کا بہت اثر پڑا ہے تاہم بہار اسکول کی روح دہلی اسکول کی داخلیت ہے۔ بہار، راسخ عظیم آبادی کے درد و سوز کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ بہار کے شعرا میں سب سے زیادہ صفیر بلگرامی پر لکھنؤ اسکول کا سایہ پڑا تھا۔ ان کے علاوہ دور متاخرین کے اکثر شعرا ایک متوازن طرز شاعری کے نمایندے تھے۔ ان کی شاعری میں دہلی کی آتش نفسی کے ساتھ لکھنؤ کی نفاست اور باقاعدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زبان کی سلاست و فصاحت کے پہلو بہ پہلو معنویت کی حلاوت بھی ہے۔ دبستان دہلی اور لکھنؤ کی خوبیوں کو نہایت ہی کامیابی سے یکجا کرنے والی ہستی حضرت شاد عظیم آبادی کی تھی۔ ان کے نغمہ میں آنے والے دور کی لے کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اگر دبستانِ بہار (Bihar School) کو حالتِ کمال میں دیکھنا ہو تو شاد کی شاعری کا مطالعہ کیجئے۔

جناب بیدل عظیم آبادی کی شاعری بہار اسکول کی شاعری ہے۔ اس میں داخلیت کے جلوے بھی ہیں اور خارجیت کے عشوے بھی۔ دور حاضر میں دو ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے بہار کی نئی پود میں ادب و شعر کا مذاق پیدا کیا اور نونہالوں کو پروان چڑھایا۔ ان میں ایک جناب بیدل عظیم آبادی کی ذات ہے اور دوسری محترم ہستی حضرت علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم عظیم آبادی مدظلہ کی ہے، حضرت عظیم، عظیم آبادی کی شاعری میں حضرت علامہ اقبال مرحوم کی شاعری کی شوکت و عظمت ہے۔ حضرت عظیم بہت بڑے نظم نگار ہیں۔ (ملاحظہ ہو ندیم ماہ اگست ۱۹۳۶ء (گیا) "علامہ عظیم کی شاعری پر ایک نظر" از اختر اورینوی)

نام، تاریخ، ولادت، وطن

نام عبدالمنان، تخلص بیدل۔ سال پیدائش جولائی ۱۸۹۴ء آپ کی عمر اسوقت پینتالیس ۴۵ سال کی ہے۔ آپ کا وطن عظیم آباد (پٹنہ) کے قرب وجوار میں ایک بستی ڈریاواں ہے آپ کی سکونت پٹنہ میں ہے۔

آپ کو تقریباً پچیس سال سے شعر و شاعری کا شوق ہے لیکن بہار کے لوگوں کی طرح آپ بھی گوشۂ عافیت کو شہرت پر ترجیح دیتے ہیں۔

خصوصیات شاعری

جناب بیدل کی شاعری میں داخلیت و خارجیت کی محض سطحی آمیزش نہیں بلکہ انکا ایک گہرا امتزاج ہے۔ داخلیت اور خارجیت کی اس تحلیل و ترکیب (Synthesis) کو تکمیل تک پہونچانے والا جوہر بیدل کا اپنا احساس شعری ہے۔ یہ احساس بہت ہی گہرا ہے اور اس کی تخلیق تجربات حیات کے بطن سے ہوتی ہے۔ بیدل کی شاعری میں درد و سوز ہے مگر مایوسی اور اضمحلال نہیں۔ شاعر زندگی کے نشاطیہ پہلو کا بھی رازداں ہے مگر اس نشاط میں بدمستی نہیں، سرور، شگفتگی اور ایک متین شوخی ہے۔ ان کی شاعری میں گریہ نالہ بے اختیار نہیں بنتا اور خندہ قہقہہ نہیں بن پاتا آئیے

ان کے گلستانِ خیال کی سیر کی جائے۔

غمِ دل سے ہے کہاں نکل کے جائے — اس کا تو یہی بس اک مکاں ہے
تم جفا پر بھی تو نہیں قایم — ہم وفا عمر بھر کریں کیونکر
نالۂ شب کا کیا نتیجہ ہوا — ہم دعائے سحر کریں کیونکر
خبر نہیں مرا تنکوں کا ایک جا کرنا — ہے بجلیوں کے لئے یا کہ آشیاں کے لئے
درد سینے میں کہاں اور کدھر ہوتا ہے — یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے ہیں مگر ہوتا ہے
تجھ کو ہر وقت ہے رونے کی ضرورت باقی — کیوں ہے پابندیِ وقتِ سحر و شام ابھی
اس طرح اس کی بزم سے اُٹھ کر چلا ہے دل — جس طرح کوئی جائے جنازہ لئے ہوئے

دیکھئے جنازہ کا رسمی مضمون کس نئی تعبیر (Interpretation) کے ساتھ بندھا، یہاں "مرگھٹ کا رونیوالا" نوحہ گر شاعر نہیں بلکہ غمِ حیات کا رازداں شاعر اپنے وارداتِ قلب کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

بیدل کے رنگِ خاص کی ایک غزل کے چند اشعار سنئے:۔

محبت میں نہیں کیا یہ تماشا دید کے قابل — مرا رو کر ہنسا دینا، ترا ہنس کر رُلا دینا
ہجومِ حشر میں کچھ سوچکر ظالم کا گھبرانا — مگر پھر دیکھ کر مجھ کو ادا سے مسکرا دینا
یہ چشمِ نیم باز اے ساقیِ مدہوش قیامت ہے — کسی میخوار کو دینا تو آدھا جام کیا دینا

بیدل کے کلام میں شگفتگی اور شوخی کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

میں بتا دوں کہ ہے کیا زیرِ غلافِ کعبہ — تیری تصویر چرا لائے ہیں بتخانے سے
ادھر آیاتِ رحمت ہیں اُدھر اقوالِ واعظ ہیں — خدا حافظ، بڑی مشکل میں ہے میرا ذوقِ عصیاں ہے
یہ تو نے کیا کہا ایماں چلا جائے گا اُلفت میں — مری ایماں فروشی ہی تو ناصح میرا ایماں ہے
کسی سے پردے پردے میں ہے شاید حالِ دل کہنا — کسی کی بزم میں پھر آجکل بیدلؔ غزلخواں ہے
دکھا دو پھر نگاہِ فتنہ ساماں کی فسوں کاری — کہ پھر در پہ ہمارے فتنۂ گردونِ گرداں ہے
یہ ہم نے کب کہا وعدہ ہے آپ کا جھوٹا — یہ کیوں قسم پہ قسم آپ کھائے جاتے ہیں
ہمارے شوق کی تکمیل ہو چلی شاید — کہ اس کے بزم میں اب بے بلائے جلتے ہیں

دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں خندۂ زیرِ لب کی موجیں مچل رہی ہیں۔ مزاح لطیف کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں

مائل اس بُت کا جدھر تیر نظر ہوتا ہے — صورتِ قبلہ نما دل بھی اُدھر ہوتا ہے
مطمئن آپ رہیں خوف کی کچھ بات نہیں — کہیں عاشق کے بھی نالوں میں اثر ہوتا ہے

شب کو سب لوگوں سے پوشیدہ جناب بیدؔل — آپ کا جانا یہ ہر روز کدھر ہوتا ہے

جناب بیدؔل کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تجرباتِ محبت نہایت ہی لطیف انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اندازِ بیان کی ندرت میں بیدؔل، مومنؔ کے پیرو ہیں۔ اندازِ بیان کی ندرت تعبیرِ نو (New interpretation) کا ایک پہلو ہے۔ شاعر کی انفرادیت اظہارِ خیال کی بدعت میں ظاہر ہوتی ہے اور فرسودہ باتوں میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔ یہ نفخِ روح شاعرانہ تخلیق ہے۔ طرزِ بیدؔل کی لطافت ملاحظہ ہو

جب بے نیازیاں تھیں محبت بھی سہل تھی — اب اس کے التفات نے مشکل بنا دیا
آغازِ جوشِ رشک کا انجام دیکھئے — مجنوں نے اپنے دل ہی کو محمل بنا دیا
رنجِ سفر کو راحتِ منزل بنا دیا — یوں ہم نے موج کو لبِ ساحل بنا دیا
وہ بزمِ غیر میں ہم سے بھی کاش کھل کے ملے — ہمارے عشق کو اس طرح راز رہنے دے
روبروِ غیر کے سب کہدئے وعدے ان کے — میری نادانی بھی اک طرح کی دانائی ہے
ان کی بے پروائیوں کا ہم کو دینا ہے جواب — کرتے ہیں یادِ خدا ان کو جلانے کے لئے
آنا وہ وعدہ کر کے کسی کا ستم ہوا — مدت سے ڈر رہے تھے اسی امتحاں سے ہم

محترمی جناب رشید احمد صاحب صدیقی اصغرؔ گونڈوی پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔ "جو شخص کنایہ کو صراحت سے جتنا زیادہ مختصر، پاکیزہ، دلکش اور معنی خیز بنا سکے اتنا ہی بڑا وہ شاعر ہے" مندرجۂ بالا اشعار میں جناب بیدؔل نے پاکیزہ کنایہ کے ساتھ معانیِ لطیف کو وصل کیا ہے اور نہایت ہی صناعانہ کامیابی کے ساتھ۔

جناب عندلیب شادانی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ اسی قطرہ، دریا، ساحل، شمع و پروانہ، لیلیٰ و مجنوں وغیرہ پرانے مضامین سے نئی باتیں پیدا کی جا سکتی اور کی جاتی ہیں۔ تعبیرِ نو کی اور مثالیں پیش کرتا ہوں:۔

قصۂ لیلےٰ و مجنوں کی حقیقت یعنے — ایک تمہیدِ مکمل مرے افسانے کی
شمع کے سامنے پروانے کے پر ہیں یعنے — چھوٹی چھوٹی ہیں کتابیں مرے افسانے کی
ہر ایک زخمِ دل عندلیب خنداں ہے — چمن میں فصلِ خزاں بھی بہار ساماں ہے
قعرِ دریا ہی جگہ گوہرِ یکدانہ کی — جو خس و خار تھے وہ تا لبِ ساحل آئے
یہ ادا قاتل کی قاتل ہو گئی — چھوڑ دینا مجھ کو قتلِ عام میں
تیرِ نظر کے شوق نے بسمل بنا دیا — یوں آرزو نے یار کو قاتل بنا دیا

حضرت جگر مرادآبادی نے شاعرانِ دہر پر عشق کی مار پڑنے کی بد دعا کی ہے کیونکہ انھوں نے "اِک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا"۔ حضرت بیدل نے کسقدر صداقتِ شعری (Poetic truth) سے لبریز عذر پیش کیا ہے۔ اس کی داد کچھ حضرت جگر مرادآبادی ہی دے سکتے ہیں۔ ان کی بد دعا تو بہر حال قبول ہو چکی۔ تیرِ نظر کا شوق رکھنا عشق کی مار نہیں تو اور کیا ہے!۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ روایات کی کورانہ تقلید بے شک بُری چیز ہے لیکن روایت (Tradition) بذاتہٖ نہایت ہی قیمتی وراثت ہوتی ہے اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ۔ بہت سے روایتی الفاظ اپنے آغوش میں ایک تاریخ کی وسعت رکھتے ہیں۔ ایک غزل گو اُن افسانہ در آغوش الفاظ کو سلیقے سے استعمال کرکے ایک جہانِ معنی کو آشکار کرتا ہے۔ اُن الفاظ کو ہٹا کر وہ کیفیات پیدا نہیں کی جا سکتیں جو ان کے موجود ہونے سے وجود میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں جناب بیدل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

ہوتے جاتے ہیں بند دیدۂ قیس، ہٹتے جاتے ہیں پردے محمل کے

یہ شعر صرف واقعات ہی کی متحرک تصویر نہیں بلکہ ایک دردخیز احساس کا لطیف اظہار بھی ہے۔ اس شعر کے بہت سے اجزائے صناعت ہیں لیکن آپ نے یہ غور فرمایا ہو گا کہ احساس کو جو شئے بہت زیادہ چھیڑتی ہے وہ قیس کے روایتی المناک انجام کا تصور ہے۔ "قیس" "پردہ" اور "محمل" کے الفاظ جادوئے ماضی کو جگاتے ہیں۔

بیدل کی شاعری مجموعہ ہے تجربہ اور تخیل کا۔ جب تک صناعت کی رگوں میں زندگی کا خون نہ دوڑے صناعت مردہ ہے۔ تجرباتِ حیات کے بغیر محض تخیل بھی بے روح ہوتا ہے تجربہ اور تخیل کا خوشگوار توازن حقیقی اور اعلیٰ صناعت کی جان ہے۔ صحت مند "مثالیت" (Idealism) "حقیقت" (Realism) ہی کی آغوش میں پرورش پا سکتی ہے اگر حقیقت کی بنیاد نہ ہو تو صناعت ایک ہوائی محل ہے۔ اسی طرح مثالیت کے رنگ و روغن کے بغیر آرٹ ہڈی کا ایک خشک ڈھانچ یا محض سنگ و خشت ہے۔

جناب بیدل کی شاعری اپنی غذا تجرباتِ زندگی سے حاصل کرتی ہے اور القارِ تخیل کے ذریعہ۔

آیئے ہم اور آپ بیدل کے آیئنے کی سیر کریں جس میں زندگی اپنی صورت دیکھتی ہے۔

ان کو یہ انتظار کہ ہم سے کچھ کہے ہم کو یہ انتظار کہ کیا التجا کریں

کہیں شرما کے وہ نہ پھر جائیں ✓ ہم نظر سوئے در کریں کیونکر

ملامت دوست کی، انکا تغافل، غیر کا طعنہ وفا دعشق کے رستے میں کتنے سنگ پارے ہیں

جب بے نیازیاں تھیں محبت بھی سہل تھی — اب اس کے التفات نے مشکل بنا دیا
ہمارا قصہ ہمارا سمجھ کے کب سنتے — بدل کے نام ہم ان کو سنائے جاتے ہیں
غمِ دل کہئے کہ غم سے مرے خوش ہوتا ہے — اس کو خوش کرنے کا بس ایک ہی عنوان نکلا
آنا وہ وعدہ کر کے کسی کا ستم ہوا — مدت سے ڈر رہے تھے اسی امتحاں سے ہم

حقیقت نگاری کا انحطاط یہ ہے کہ اس میں بازاری ابتذال پیدا ہو جائے۔ لکھنؤ اسکول کی معاملہ بندی اسی قسم کی سوقیانہ پن کی مثال ہے۔ بیدلؔ کی حقیقت نگاری دہلی اسکول کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں سچائی ہے مگر بے حیائی نہیں۔ بیدلؔ اس لحاظ سے بھی مومنؔ سے مشابہت رکھتے ہیں۔

تجربات کی دنیا کی سیر ہو چکی اب عالمِ تخیل کے تماشے دیکھئے:۔

ہیں مصور جمالِ قاتل کے — آئینے دیدہ ہائے بسمل کے
ہوتے جاتے ہیں بند دیدۂ قیس — ہٹتے جاتے ہیں پردے محمل کے
آئینہ خانہ اک بنالیں گے — مول لیتے ہیں ٹکڑے وہ دل کے
کافرِ عشق کا زنار ہے — مصرفِ تارِ گریباں دیکھئے
خدا جانے کہ دل میں انکے کیا ہے، کیا سمجھتے ہیں — ہمارے زخمِ دل ہنستے ہیں کیوں مرہم کے ساماں پر
سوزشِ پنہاں ہماری شمع روشن بن گئی — حسرت وارماں، ذوق وشوق پروانے ہوئے
شیشہائے دل کی رنگینی کوئی دیکھے ذرا — ہوکے ٹکڑے ٹکڑے بھی دلکش پریخانے ہوئے
تجدیدِ وعدہ پھر ہوئی تمہیدِ اضطراب — پھر خرمنِ امید ہے شعلہ لئے ہوئے
لگی وہ آگ اندیشہ نہیں اب جسکے بجھنے کا — کہ سینے میں دلِ سوزاں چراغِ زیرِ داماں ہو

تعبیرِ جدید کے تحت میں جو اشعار پیش کئے گئے ہیں، وہ بھی تخیل کی مثال میں عرض کئے جا سکتے ہیں۔

میں نے قبل عرض کیا ہے کہ بہارؔ پر دبستانِ لکھنؤ کا اثر ضرور پڑا ہے لیکن زیادہ تر اس کی خوبیاں یہاں آئی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں خامیوں کا سایہ بھی نظر آجاتا ہے۔ بیدلؔ کی شاعری میں بھی رسمی (Conventionalism) اور بے جان طرز کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

بچھا رہے ہیں محبت کی راہ میں کانٹے — دلِ غریب پہ میرے یہ جورِ مژگاں ہے
چیں جبیں پہ ہو، بل ابرو پہ ہو، اور ہاتھ میں تیغ — جان لینی ہو تو اس شان سے قاتل آئے
پارہ ہائے دلِ صد چاک سرِ مژگاں پر — کشتیٔ عشق کے تختے لبِ ساحل آئے
رشتۂ تسبیحِ الفت شہرگِ جسمِ نحیف — مہرہ ہائے استخواں تسبیح کے دانے ہوئے

آخری شعر میں "ناسخیت" کی تکمیل ہوگئی ہے۔ بیدل کی خامیاں کہیں تو تخیل کی بے راہ روی کے سبب ہیں اور کہیں رسمیت کی غلامانہ پیروی کی وجہ سے۔ لیکن بیدل کے آرٹ میں نقص کم ہے۔ اس کانِ سخن سے ہیرا زیادہ نکلتا ہے اور کوئلہ قلیل مقدار میں۔

جناب پروفیسر فراق گورکھپوری نے مصحفی کے انفرادی رنگ سخن کا جایزہ لیتے ہوئے نگار کے مصحفی نمبر میں لکھا تھا کہ: "مصحفی داخلیت اور خارجیت کے دوراہے پر ہیں۔ یہیں دہلی اور لکھنؤ سکول کا سنگم ہوتا ہے.... ان کے کلام میں میر، سودا، جرأت اور انشاء سب کے انداز ہیں مگر اپنے خاص معتدل رنگ میں"۔ (نگار جنوری ۱۹۳۹ء) میں نے بھی قبل عرض کیا ہے کہ بہار یا عظیم آباد اسکول کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں لکھنؤ کی خارجیت اور دہلی کی داخلیت کا امتزاج ہے۔ اس جگہ میں ایک نکتہ واضح کر دینا چاہتا ہوں جس سے آپ کو بہار اسکول کی انفرادیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

لکھنؤ اسکول کی خارجیت دہلی کی داخلیت کے ردِ عمل (Reaction) کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ لہذا وہ افراط کی شکار ہوگئی جو ردِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اسکول میں خارجیت کے معائب و نقایص زیادہ پائے جاتے ہیں۔ مصحفی نے خارجیت کی طرف مجبوراً قدم اٹھایا۔ وہ جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو وہاں کے رنگِ سخن اور وہاں کی معاشرتی فضاء سے متاثر ہوئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ اُس فضاء سے مطابقت و مناسبت (Adaptation) پیدا کی۔ ایک تو اُن کا رچا ہوا دہلی کا رنگ قدیم اور ایک یہ نیا انداز لکھنؤ، ان دونوں میں تصادم ہوا اور نئے میلان نے اپنا اقتدار جما لیا لیکن پرانا رنگ فنا نہ ہو سکا۔ مصحفی کے کلام میں بیشتر ان دونوں رجحانات یعنی داخلیت اور خارجیت کی کُل آمیزش نہ ہو سکی۔ مصحفی کے آرٹ کا بیشتر حصہ داخلیت اور خارجیت کا صرف "آمیختہ" (Mixture) ہے، "مرکب" (Compound) نہیں۔ تاہم مصحفی کے کلام میں کامیاب امتزاج کی مثالیں بھی ملیں گی اور کافی ملیں گی۔

بہار اسکول دہلی اور لکھنؤ ہر دو اسکولوں سے متاثر ہوا ہے۔ یہاں داخلیت پر خارجیت کا رنگ ردِ عمل کے طور پر نہیں چڑھا بلکہ "مفاہمت" (Compromise) کے انداز سے۔ راسخ عظیم آبادی کی داخلیت بہار پر چھائی ہوئی تھی کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری کا غلغلہ بلند ہوا۔ عظیم آباد، دہلی اور لکھنؤ کے تصادم سے دور تھا لہذا یہاں لکھنؤ کا اثر تدریجاً ہوا۔ ان دو میلاناتِ سخن یعنی داخلیت اور خارجیت کی آمیزش کے نتیجہ میں جو رنگ سخن بہار میں پیدا ہوا اُس میں فطری ارتقاء کی جھلک ہے۔ لہذا شاد عظیم آبادی کا آرٹ داخلیت اور خارجیت کا "مرکب" ہے، محض "آمیختہ" نہیں۔ یہی بہار اسکول کی انفرادیت ہے اور اس مرکب میں داخلیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔

بیدل عظیم آبادی بھی دبستانِ بہار کی پیداوار ہیں۔ ان کی صناعت میں بھی خارجیت اور داخلیت کی انتہائیں (Extremes) نہیں ملیں گی اور ان کے یہاں متذکرہ بالا مختلف رجحانات کا امیل پن بھی کم نظر آئے گا۔ ان کا آرٹ بھی داخلیت اور خارجیت کا ایک کامیاب امتزاج ہے۔ جس میں داخلیت زیادہ ہے۔ راسخ عظیم آبادی کے نغمے کی تھرتھری غیر فانی ہے۔ بیدل کی شاعری میں سوز و ساز کی آمیزش ہے اور سوز ہو یا ساز بیدل کی متین مگر جاگتی ہوئی شوخی ہر جگہ نظر آجاتی ہے۔ ان کے "درد" (Pathos) میں ایک لطیف "طنز" (Satire) بھی پایا جاتا ہے ؎

نالۂ شب کا کیا نتیجہ ہوا ہم دعائے سحر کریں کیونکر

بیدل کے یہاں جذبہ، تخیل، محاکات، صداقت اور سادگی سب کچھ ہے۔ یہ چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ملیں گی لیکن لب و لہجہ، اندازِ بیان اور تیور کی شوخی قریباً ہر جگہ ملے گی۔

داخلیت اور خارجیت کے توازن کے سبب بیدل کی شاعری جنون تو بن ہی نہیں سکتی ہے تاہم اس میں تجربات کی وسعت اور احساسات کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ بیدل کی صناعت میں کہیں کہیں پھیکے پن اور اُداسی بہت ہی کھٹکتی ہے۔ لیکن یہ البیلی شوخی، یہ لطیف شرارت یہ خوشگوار مزاح اور شاداب و جاندار اندازِ بیان اس کمی کو پورا کئے دیتے ہیں۔

آیئے رخصت ہوتے ہوئے میں آپ کو بیدل عظیم آبادی کے چند اشعار سنا دوں:۔

سلامت کا خیال آوارہ گردوں کو نہیں زیبا کہیں کشتی مری آرائشِ ساحل نہ بن جائے
میں کچھ کہتا نہیں ہوں لیکن ان کو بدگمانی ہے لبِ خاموش ہی عرضِ نیازِ دل نہ بن جائے
تمہاری چشمِ سحر انگیز سے اندیشہ ہوتا ہے مرا دل میرے سینہ میں تمہارا دل نہ بن جائے
جگہ دی کیوں بلا کر مجھ کو تو نے بزمِ عشرت میں صدائے نغمہ آوازِ شکستِ دل نہ بن جائے

اختر اورینوی (ایم۔ اے)

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ر علاوہ محصول۔ منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چین و جاپان کی جنگ سے ہم کو کیا سیکھنا چاہئے

ستر سال اُس طرف کی بات ہے کہ جاپان کا مرتبہ دنیا کے سیاسی نقشہ میں صفر کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایک نیم اقطاعی (Semi Feudal) قسم کی حکومت تھی جہاں غاصب و ظالم امراء قابض تھے اور جہل و افلاس، جور و تعدی کا دور دورہ تھا، ان امراء میں باہم جنگ و جدال جاری رہتی تھی اور امن و سکون کا کہیں پتہ نہ تھا۔ لیکن صرف نصف صدی کے اندر اس نے اتنی ترقی کر لی کہ آج دنیا کی بڑی طاقتوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے اور اقتصادی و صناعی حیثیت سے وہ اکثر مغربی حکومتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس کا راز جاپانیوں کی دو خصوصیتوں میں پنہاں ہے، ایک یہ کہ وہ حد سے زیادہ وطن پرست ہیں اور دوسرے یہ کہ اُن میں حالات زمانہ کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لینے کی بڑی زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے۔

ملک کی محبت ان میں جس حد تک پائی جاتی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنے جان و مال کی قربانی کو وہ ادائے وطن کی ادنیٰ خدمت سمجھتے ہیں اور یہ جذبہ ان میں اس خیال سے پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی قوم کو تمام دنیا کی قوموں سے برتر و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ جذبہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اپنے اپنے زمانہ میں یونانیوں، رومیوں، ترکوں اور ہسپانیوں وغیرہ میں بھی یہی جذبہ پایا جاتا تھا اور وہ بھی اپنے کو خدا کی برگزیدہ قوم سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی یہی حال ہے، انگریزوں کو دیکھئے کہ وہ اپنے آپ کو کس قدر بلند سمجھتے ہیں اور امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ بھی سب پر ظاہر ہے۔ افریقہ کے کلبوں میں عام طور پر یہ ہدایت آویزاں رہتی ہے کہ "کتا اور دیسی آدمی اندر نہیں جا سکتے"، خود ہندوستان کو دیکھئے کہ انگریزوں کے کلب ہندوستانیوں سے علٰحدہ ہیں، ٹرینوں میں ان کے ڈبے جدا ہیں، شہروں میں ان کے ہوٹل مخصوص ہیں۔

جاپانیوں کی ایک اور خصوصیت بھی قابل غور ہے، وہ یہ کہ اپنے بادشاہ سے محبوبانہ محبت رکھتے ہیں۔ ایک بار کسی اسکول میں آگ لگی تو طلبہ باہر آ گئے اور باہر آنے کے بعد معلوم ہوا کہ بادشاہ کی تصویر اندر ہی رہ گئی ہے چنانچہ ایک طالب علم دہکتی ہوئی آگ کے اندر چلا گیا اور اپنا پیٹ چاک کر کے تصویر اندر رکھ لی تاکہ اسے آگ سے

صدمہ نہ پہونچے۔ اسی طرح کونٹ نوگی نے (جو روس و جاپان کی جنگ میں خاص شہرت حاصل کرچکا تھا) جب یہ سنا کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا ہے تو فوراً اس کے لاشہ پر جاکر خود بھی مرگیا۔

جاپان کی حکومت ۲۶۰۰ سال سے مسلسل ایک ہی خاندان میں چلی آرہی ہے، اور میکاڈو کے ساتھ جو والہانہ محبت ان میں پائی جاتی ہے، وہ حقیقتاً ان کے سماجی اتحاد کی سنگ بنیاد ہے جس پر ان کی قومیت کی تعمیر قایم ہوئی ہے۔

ابتدائی سطروں میں ان کی دو مخصوصیتوں کا ذکر کیا گیا تھا ایک ان کی محبتِ وطن جس کا بیان ہوچکا اور دوسری زمانہ کے موافق اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلینے کی صلاحیت، سو اس کا یہ حال ہے کہ اگر اس قوم کو دنیا کی بہترین نقال قوم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے حروفِ ہجا اور اپنا مذہب ہندوستان سے لیا، تجربہ کا انداز، آرٹ، لٹریچر اور معاشرت چینیوں سے لی، کلچر پہلے اہل کوریا کا اختیار کیا اور پھر اہل مغرب کا۔ صنعتی تنظیم جرمنی اور امریکہ سے سیکھی اور اتنی تکمیل کے ساتھ کہ سب سے بازی لے گیا۔

جاپان کا مزدور (خصوصیت کے ساتھ عورت) مہارت و تیزی کے لحاظ سے ضرب المثل ہے اور چھوٹے سے چھوٹا گاؤں یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فیکٹری نہ پائی جائے۔ ہندوستان کی طرح وہاں کی آبادی بھی ۸۰ فی صدی زراعت پیشہ ہے۔ لیکن وہاں کا کسان ہندوستانی کسان کی طرح سال میں چھ مہینے بیکار نہیں بیٹھتا بلکہ گھریلو صنعت میں صرف کرتا ہے جس کا گھر گھر رواج ہے۔ وہاں کی عورت، وہاں کا بچہ اور بوڑھا کوئی بیکار وقت ضایع نہیں کرتا، کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا ہے۔

جاپانی سپاہی بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا میں فرد ہے۔ بہادری میں اس کا جواب نہیں اور اقدام کا حکم پانے کے بعد وہ منھ پھیرنا یا واپس لوٹنا تو جانتا ہی نہیں خواہ کچھ اس پر گزر جائے۔ جاپانی جنرل فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی فوجی ہدایتوں میں باترتیب پسپائی کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے کیونکہ جاپانی فوج کبھی پیچھے لوٹتی ہی نہیں۔

مصنوعی جنگوں میں بھی وہاں کا سپاہی اس قدر گرمجوشی سے کام لیتا ہے کہ اگر احتیاط نہ کی جائے تو خونریزی ہوجائے۔ ان کی جانبازی کی بہترین مثال میں ۳۲ء کے حملۂ شنگھائی کا وہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے، جب تین جاپانیوں نے ایک لمبے بانس میں پھٹنے والا مادہ بھر کر اپنے جسم سے باندھ لیا اور چینی خندق میں پھاند پڑے انھیں یقین تھا کہ اس طرح ان کے گوشت کا ریشہ ریشہ علحدہ ہوجائے گا، لیکن انھوں نے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی اور چینی خندق کو تباہ کرکے رکھدیا۔ یہ لڑائی کے اتنے شوقین ہیں کہ بعض اوقات بے محل حملہ کر بیٹھتے ہیں اور کافی نقصان اٹھاتے ہیں چنانچہ ۳۲ء میں چپائی کے مقام پر یہی ہوا۔

جاپانی سپاہی جتنا بہادر ہے اتنا ہی سادہ بھی ہے۔ اس کی وردی میں کوئی چیز نمایش کی نہیں ہوتی یہاں تک کہ افسران بھی اوورکوٹ استعمال نہیں کرتے۔ ان کی غذا بھی بہت سادہ ہوتی ہے، تھوڑے سے چاول اور گھاس پات اس کے لئے کافی ہے۔ قواعد کے وقت وہ باقاعدہ قدم اُٹھانے کی پرواہ نہیں کرتے لیکن جنگ کے وقت جان پر کھیل جانا ان کے لئے معمولی بات ہے۔ ٹین کنگ کا قبضہ جرأت و استقلال کے لحاظ سے تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگا اور ۱۸۹۴ء کی لڑائی میں اور جنگ منچوکو میں جاپانیوں نے جتنے کم نقصان کے ساتھ فتح حاصل کی اس پر دنیا حیرت کرتی ہے۔

جاپانی افسر بھی مہارت فن کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتا ہے، چنانچہ حال ہی میں کینٹن کا قبضہ اس کا بین ثبوت ہے کہ ۶۰ ہزار فوج نے ایک ہفتہ کے اندر ۸۰ میل کا نہایت دشوار گزار راستہ طے کر کے فتح حاصل کرلی اور کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔

موجودہ جنگ میں، چین کی مسلسل شکستوں کے اسباب کھلے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں چینی تعداد میں بہت زیادہ ہیں، ان میں جرأت کی بھی کمی نہیں، ان کی قوتِ تحمل بھی بہت بڑھی ہوئی ہے، پھر بھی وہ برابر شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔ اس کا سبب فوج کی عدم آراستگی، متحدہ قیادت کا فقدان اور عزم فتحیابی کا ضعف ہے۔ برخلاف اس کے جاپانی افواج جدید ترین آلات حرب سے آراستہ ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ چین کی حکومت میں کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی اور مختلف صوبوں کے گورنروں نے آمرانہ حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ہر چند وہاں کی قومیت کا احساس کافی پیدا ہو گیا ہے، لیکن ابھی اُس میں اتنا استحکام پیدا نہیں ہوا کہ جاپان کے حملہ کا جواب دیا جائے۔ چین کے فوجی افسران مہارت فن کے لحاظ سے بھی اچھے نہیں ہیں اور بعض بعض کی دیانت بھی قابل اعتراض ہے، الغرض جاپان کی کامیابی کے اسباب متعدد ہیں اور اس جنگ میں ہمارے لئے بہت سے درس پنہاں ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہم بین الاقوامی سیاسیات کے کھیل میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کرسکتے جب تک خود ہماری اپنی مضبوط فوج موجود نہ ہو۔ محض گاندھی کی اہنسا یا آسمانی روشنی سے کوئی قوم آزاد نہیں ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ حق و صداقت کی جنگ میں روحانی قوت بھی نظرانداز کرنے کی چیز نہیں لیکن صرف ذہن و خیال کی پختگی بیکار ہے اگر ظاہری اسباب مدافعت کے ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ وہ قومیں جو آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے جسمانی سختیاں برداشت کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کریں، محنت و جفاکشی کا اپنے آپ کو عادی بنائیں اور قومی اغراض کے مقابلہ میں ذاتی مقاصد کو ترک کردیں۔ فاتح قوموں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی نے محض روحانی قوت سے کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ جسم کی

اس عقیدہ کا سبب بھی وہی غلط سوال ہے کہ "کائنات پر کون حکومت کرتا ہے" کیونکہ اس سوال سے قبل ایک شخص فرض کر لیتا ہے کہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح کوئی ہستی ایسی ضرور ہے جو اس انتظام کی ذمہ دار ہے۔ حالانکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "کائنات خود آپ اپنی حکمراں ہے"۔

اگر خدا واقعی موجود ہے تو بھی اس کا علم ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا اور مذاہب نے جو تصور اس کا پیش کیا ہے وہ بالکل دنیاوی مشاہدات و تجربات کی بناء پر ہے اور حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

یہی حال حیات بعد الموت کا ہے کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت اس کا بھی موجود نہیں کہ مرنے کے بعد روح واقعی باقی رہتی ہے، چہ جائیکہ حیات بعد الموت کی نوعیت و کیفیت پر رائے زنی کرنا۔ پھر جب صورت حال یہ ہو تو آیندہ زندگی کی فلاح و نجات کی فکر بھی فضول ہے۔ جس طرح خدا کا تصور محض وہم و گمان کا نتیجہ ہے اسی طرح نجات اخروی کا خیال بھی ایک لایعنی مفروضہ پر قایم ہے۔

اگر ہم نجات کے مسئلہ پر اس دنیا کی روشنی میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ہم اپنی فطرت کے مختلف داعیات میں ہم آہنگی پیدا کر کے نظام تمدن میں عضو مفید ثابت ہوں۔

ایک مذہبی انسان یہ بھی سوال کرتا ہے کہ اگر خدا اور حیات بعد الموت کے عقیدہ کو ہٹا دیا جائے تو پھر رہ کیا جاتا ہے۔ یہ سوال بھی بالکل اس بناء پر کیا جاتا ہے کہ اس نے پہلے سے یہ سمجھ رکھا ہے اور ایسا ہی سوچنے کا وہ عادی ہے، ورنہ واقعات کی حیثیت سے دیکھئے تو اس عقیدہ کے حذف کرنے کے بعد بھی بہت کچھ باقی رہتا ہے تاریخ سے ثابت ہے کہ بہت سے ایسے انسان گزرے ہیں جو بلند اخلاق و مقاصد رکھتے تھے اور خدا کے قایل تھے نہ حیات بعد الموت کے۔ چنانچہ بودھ کا بھی مسلک یہی تھا اور رواقیین کا بھی۔ اچھے کام کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص خدا کا قایل ضرور ہو، جبکہ ہم بہت سے خدا کے ماننے والوں کو مبتلائے معصیت دیکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے اگر خدا کو ماننے کے بعد اس کے خوف و خوشنودی یا جزا و سزا کے خیال سے کوئی اچھا کام کیا بھی جائے تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ اخلاق کی بلندی کا صحیح معیار اسی وقت قایم ہو سکتا ہے جب بغیر کسی خوف یا طمع کے محض ایثار و قربانی کی بناء پر کوئی نیک کام کیا جائے۔ پھر آج جبکہ سائنس نے کافی ترقی کر لی ہے اس کا بہت امکان ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ ہم حادثات و مصائب کو مقدر کا لکھا ہوا یا غیبی فیصلہ سمجھ کر خاموش ہو جائیں۔ ہمارے اسلاف وباؤں کو خدا کا قہر سمجھکر دم بخود ہو جاتے تھے لیکن اب ہمیں ان کے اسباب معلوم ہیں اور ان کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ طوفان اور زلزلوں کو ہمارے بزرگ ہمارے اعمال کی سزا جانتے تھے، لیکن اب ہم جان گئے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ الغرض اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو ہم کو خدا کی طرف سے خائف رکھتی تھیں، لیکن اب ہم

اب ہم ان کی علمی توجیہہ کر سکتے ہیں اور اس لئے خدا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پھر اگر ہم سائنس سے پوری طرح مدد لیں تو نہ صرف یہ کہ ہماری موجودہ ذہنی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں بلکہ جدید نفسیاتی تحقیق کی بناء پر آئندہ نسلوں کی تعلیم کے لئے ایسے اُصول اختیار کر سکتے ہیں، جس سے یہ خوف بالکل مفقود ہو جائے اور اچھے کام کرنے کی صلاحیت ابتدا ہی سے اس میں پیدا ہو سکے۔

خدا کا خوف، عذاب کا ڈر، ثواب کی طمع اس وقت تک انسان کو معصیت سے باز نہیں رکھ سکے، لیکن سائنس اس میں کامیاب ہو سکتی ہے اور جو مقصد مذاہب سے پورا نہیں ہو سکا وہ علم و عقل سے پورا ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا کے ماننے کا نہ کوئی حقیقی سبب موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت۔

جولین ہکسلے کا یہ بیان یقیناً اہل مذاہب کو بہت برافروختہ کر دینے والا ہے، لیکن محض ان کی برہمی یا ناخوشی کسی شخص کے ذہنی و طبعی رجحان کو نہیں پلٹ سکتی اور نہ ایسے لوگوں پر صرف لعنت بھیجنے سے اس گمراہی کا (اگر یہ واقعی کوئی گمراہی ہے) علاج ہو سکتا ہے۔

اس کو اہل مذاہب اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں (گو وہ زبان سے نہ کہیں) کہ مذہب کے خلاف سائنس نے اتنا زبردست محاذ قایم کر لیا ہے کہ صرف خدا کے بھروسہ پر اسے نہیں چھوڑ سکتا، کیونکہ اگر خدا موجود ہے اور اسی شان و شوکت کا جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو نہ اسے کسی مذہب کی پرواہ ہو سکتی ہے، نہ اہل مذاہب کی۔ وہ اگر مذہب والوں کا خدا ہے تو سائنس والوں کا بھی ہے، بلکہ سائنس والوں کا زیادہ ہے کیونکہ انھوں نے جس قدر اور جس طرح اس کی حقیقت کو سمجھ کر نوع انسانی کی جتنی خدمت کی ہے، مذاہب نے نہیں کی ہے۔ الغرض ان حالات میں اگر مذہب کی بقا کی کوئی صورت ہے تو وہی جسے "جادلهم بالتی ہی احسن" کہتے ہیں، یعنی علم کا مقابلہ علم ہی سے کرنا ہوگا، بجلی کی روشنی کے سامنے آپ چراغ لیکر نہیں جا سکتے اور اس کی صرف یہی تدبیر ہے کہ یا تو آپ علم ہی کی مدد سے ان شبہات کو دور کیجئے جو علم نے پیدا کئے ہیں یا اُن کو تسلیم کرنے کے بعد مذہب کا کوئی ایسا لچکدار مفہوم پیش کیجئے کہ آپ اس طبقہ کو کافر کہنے پر مجبور نہ ہوں۔

مذہب کی شکست کا بڑا سبب اس کی روایات ہیں، درانحالیکہ نفس مذہب سے انھیں کوئی واسطہ نہیں اور سائنس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس کے علمی مشاہدات و تجربات ہیں جو یکسر مذہب میں جگہ پانے کے قابل ہیں۔ اس لئے اگر مذہب کی غیر ضروری وسعت کو محدود کر کے اُسے خدا و تصور خدا سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے تو پھر اختلاف صرف نام کا رہجاتا ہے اور یہ کوئی اصولی اختلاف نہیں جو دو جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دے۔

اگر حشر و نشر، عذاب و ثواب، حور و قصور، بہشت و دوزخ، معجزہ و الہام وغیرہ سے قطع نظر کر لیا جائے

تو بھی خدا کی اہمیت بدستور باقی رہتی ہے اور دنیا کا بڑے سے بڑا ملحد، سخت سے سخت کافر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات جس کی وسعت کو دیکھ کر عقل انسانی حیران ہے اور یہ اس کا مستحکم نظام جس میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی بال برابر فرق نہیں پڑتا، ضرور کسی قوت کار فرما کا نتیجہ ہے اور کبھی انسان کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔

لیکن دشواری یہی ہے کہ مذہب کی ترکیب میں جزو غالب انسانی عناصر کا ہے اور انسان اسے گوارا نہیں کرتا کہ وہ ان باتوں کو مذہب سے علحدہ کر دے جن کی مدد سے خود اس نے دنیا میں خدائی کی تھی۔

پھر اس وقت جبکہ دنیا میں ڈماکریسی و اشتراکیت کا غلبہ ہے، یہ استبداد کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے اور ہم ایک بات پر صرف اس دلیل کی بناء پر کیونکر ایمان لا سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی کہتے تھے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان:۔ مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم، ایل اے۔ ایم، ایل سی، مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حال سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہونچا دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان اُمور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ۵۰۳ صفحات قیمت مجلد ۸؍

مضامین محمد علی:۔ مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ مجلد ۸؍

مضامین رشید:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عا؍

میدان عمل:۔ ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۸؍

بیوہ:۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں، ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ قیمت مجلد عہ؍

منیجر نگار لکھنؤ

چھتری

یہ مقالہ نہ مزاحیہ نگاری کے تحت آتا ہے نہ سنجیدہ مقالے کے۔ بلکہ یہ ایک اور رنگ ہے جسے ایک نوع کا (Essay) کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی ناولوں میں سب سے پہلے (Woodehouse) نے اسے پیدا کیا اور اسی کے ساتھ اس کو ختم ہو جانا ہے۔

مزاحیہ نگار کی حیثیت سے (Woodehouse) کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا، درانحالیکہ اسکے عشاق کی بڑی جماعت اس وقت دنیا میں موجود ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی تحریر میں آورد کے سوا کچھ نہیں اور بے ساختہ پن جو مزاح کی جان ہے اس میں بالکل نہیں پایا جاتا لیکن اسی کے ساتھ اس کا ادبی تجزیہ ضرور قابل ستائش ہے یہی بات اس مقالہ میں بھی ہے کہ مزاح کی بات تو اس میں کوئی نہیں ہے لیکن جزئیات کا احاطہ پوری طرح کیا گیا ہے جو آسان کام نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اس کو پڑھکر بجائے ہنسی کے کسی کو غصہ بھی آئے، لیکن اگر مزاحیہ خیال سے ہٹ کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی بعض خصوصیات کی داد دینا پڑے گی۔

فضل احمد صاحب صدیقی کی مشق اگر جاری رہی تو ایک وقت آئے گا کہ ان کی تحریر سے مزاحیہ رنگ ختم ہو جائے گا اور وہ ہیزلٹ (Hazlitt) کے رنگ کے مقالہ نگار ہو جائیں گے جو استقصاء جزئیات میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

نیاز

چھتری اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس کے لگانے کے لئے بھی شرط یہ ہے کہ ہر حالت میں کلیجہ سے لگا کر رکھا جائے، بشرطیکہ آپ چوراہے کے پولیس کانسٹبل نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں تو خود آپ کی آستینوں پر اور آپ کی چھتری جس کے ٹپ پر مارکین کا چولہ چڑھا ہوگا اور آپ اس کی ڈنڈی کو اپنے نیفے یا پیٹی میں اڑسے اچھے خاصے "شیخ ڈونڈوں" بنے بیچ سڑک میں کھڑے ہوں گے۔

چھتری سے انسان کی دوربینی اور سوجھ بوجھ ایسی ہی ٹپکتی ہے جیسے ننھی ننھی بوندیں ساون بھادوں میں

یا کسی لیڈر کی گفتگو سے سیاست، ذرا سوچئے تو سہی کہ جب چھتری نہ ہوگی تو اس آدم کی اولاد کی کیا مٹی خراب ہوگی۔ جیٹھ بیساکھ کی دھوپ، سورج کی دوپہر ڈھلے کی کرنیں سر کے پار ہوجاتی ہوں گی، دماغ کڑھائی کے تیل کی طرح کھولتا ہوگا۔ پھر برکھا میں جب دونگڑا پڑتا ہوگا تو بارش کے تھپیڑے منہ پھیر دیتے ہوں گے اور ماہ پوس کی مہاوٹوں میں نمونیہ اور گٹھیا سے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دم کا اینٹھ جانا اور تن کے کپڑوں کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونا اور موت کے گھاٹ اُتر جانا روز کا قصہ ہوگا۔ مبارک ہے وہ بندہ جس نے چھتری ایجاد کی اور انسانیت پر احسان عظیم کیا۔

آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ یہ چھتری، یہ آشیانۂ عافیت ہے کیا؟ یعنی یہ چلتا پھرتا دستی شامیانہ کتنی بانس بلیوں اور تان تنبو سے مل کر بنا ہے۔ سنئے، ایک ڈنڈی لوہے یا لکڑی کی، جیسی توفیق خدا دے، لوہے کی ۸-۹ کامنی تیلیاں اور دوہری کمانیاں، کچھ کپڑا، جھنڈی نما بیروں کی شکل جیسے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کپڑے کے لئے اب کالے گورے کی قید بھی نہیں رہی، سب رنگ پر میسر ہے اور اس کے علاوہ ایک کھٹکا یا بلبلی ڈنڈی میں لگی ہوئی اور کچھ ضروری ٹانکا ٹوبھا، کیل کانٹا، اِدھر اُدھر اور بس۔ لیجئے، اللہ کی امان اور پیروں کا سایہ ہوگیا۔ یعنی چلئے کہاں چلتے ہیں آپ چھتری طیار ہے!

یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ لفظ چھتری ممکن ہے بعض لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کردے۔ بھاشاؤں کی چھان بین کرنے والے تو خدا جانے کیا کیا جگت ملاتے ہوں گے، یعنی یہی کہ نواب صاحب چھتاری سے چھتری کا کچھ تعلق بھڑایا جاسکتا ہے، اس طرح کہ شاید ان کے مہاپرشوں نے اس چیز کو پہلے پہل بنوایا ہو اور رفتہ رفتہ اسی چھتری کو الف مد آ کے سہارے ذرا اُبھار کر چھتاری ان کی راجدھانی کا نام رکھا گیا ہو۔ شاید تاریخی شہادت اس بات کی بھی لائی جائے کہ چھتری قوم کی پناہ آفرینی کے باعث اس چیز کا نام بھی چھتری پڑا کیونکہ یہ آسمانی بلاؤں سے ایسے ہی پناہ دیتی ہے جیسا کہ بہادر چھتریوں نے ہندوستان پر حملہ آوروں کے سامنے اپنے سینے اڑائے۔ لیکن لفظ چھتری جو قوم سے منسوب ہے اس میں 'ت' پر تشدید ہے (حوالہ کے لئے دیکھئے نور اللغات) جناب، نہ نواب صاحب چھتاری سے تعلق، نہ مہتر چترال سے واسطہ، نہ چھتریوں سے ناتہ، یہ لفظ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لفظ 'چتر' سے بگڑا ہے، 'چتر' بمعنی گول جیسے آسمان، یا تاج، طرہ جو سر پر سایہ کرے وغیرہ

بعض اونچی نگاہ اور لمبی ناک والے، چھتری کو چھاتہ بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بیٹھے بٹھائے گرامر کی ٹانگ توڑا کرتے ہیں اور نئے نئے قصے گھڑے کیا کرتے ہیں غالباً لکھنؤ اور دہلی کی وہ زبانی جھونک جو "دہی کھائی" اور "دہی کھایا" کے قبضہ پر چلی آتی ہے ایسے ہی مہربانوں کی جمائی ہوئی ہے۔ یہ وبا اب عام ہوتی جارہی ہے یہ "نوزبانئے" "ابروزن" "نودولتے" جن کی اس زمانہ میں کمی نہیں) گلی کو "گلا"، "کنڈی" کو "کنڈا"، "بہشتی" یا

بھشتی کو "بھشتا" کہہ کہہ کر کس بل دکھایا کرتے ہیں، ایک دوسرا گروہ اور ہے۔ جنکی چال انگریزی۔ ڈھال انگریزی۔ جسم کا بال بال انگریزی، مگر "ر" کی ہمیشہ اڑہی مار دیتے ہیں، مثلاً پوری کچوری کو "پوڑی کچوڑی" گھبرانے کو گھبڑانا" "پکھری کو پکھڑی" اور "چپراسی کو چپڑاسی" کہہ کر اپنی سخت جانی کا ثبوت دیا کرتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ البتہ اک نسخہ بتاتے ہیں، وہ یہ کہ ان کی زبان اور تالو پر پیپڑیا کتھ بُرکا جائے اور دماغ پر شیر خشت کی مالش کی جائے، انشاء اللہ کوئی شکایت نہ رہ سکے گی، غیب کا حال خدا جانے۔ رہا چھاتہ اور چھتری کا معاملہ، سو مرزا غالب کی جو رائے رتھ کے متعلق تھی وہی ہماری اس چیز کے متعلق ہے۔ یعنی یہ کہ جب مرد چھتری لگائے ہو اُسے چھاتہ کہہ لیجئے اور عورت لگائے ہو تو چھتری رہنے دیجئے۔

چھتری کو دیکھ کر بچہ میں میکانکی رجحان پیدا ہوتا ہے کیونکہ اک ہندوستانی متوسط گھر میں قینچی سروتہ، سنگر مشین انسونیا کا گھنٹہ، ڈیٹز کی امریکن لالٹین جیسی اینچ پینچ کی چیزوں کو چھوڑ کر جو سیدھا سچا کل پرزہ بچوں کے ہاتھ پڑتا ہے وہ شاید چھتری ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا دل بھی چچا صاحب کی چھتری ہی میں اٹکا تھا اور ہر روز ہم چھتری کو گھسیٹتے لے جانے کے شوق میں مکتب بلاناغہ جاتے تھے۔ شوق بڑھا تو ایسا کرتے تھے کہ چھتری کسی بزرگ سے کھلوا کر لیجاتے اور شام کو گھر آکر ہی اس کو بند کرا لیتے۔ راہ میں کبھی اس کے بند کرنے کا بندوبست نہ تھا۔ ہاں ایک روز کوشش کی تو اس طرح کہ ایک لڑکا اینٹ لایا اور دوسرے نے کُھلی چھتری کو چت لٹا کر تھامے رکھا اور پھر لگنے دیجئے نشانہ کھٹکے پر۔ ایک ذرا آگے بڑھ کر جو لگایا تو بیٹھ ہی تو گیا اور دوسرے منٹ میں بمصداق "ڈبک شیرے کے مٹکے میں"

چھتری ہمیں بری بلا کی طرح لپٹ گئی۔ ہماری گردن اور آدھا دھڑ چھتری کی پوٹ میں لپٹا ہوا اور ہم دم سادھے رکوع کی حالت میں آدھے خدا ترس انسان اور آدھے گھوس بنے کھڑے ہیں یا پورے سائمن کمیشن اس لئے کہ ہمارے ساتھی ہمیں دیکھ کر یہ جا وہ جا! چھتری کا اس طرح بلائے ناگہاں کی طرح بند ہو جانا سہما دیتا ہے اور شہادت کی اُنگلی میں بھی کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور آتی ہے۔ ہمارا ابھی دل اسی لئے چھتری سے کھٹا ہو گیا تھا مگر اس کی تو بناوٹ اور ترکیب ہی اس ڈھب کی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ اقلیدس کی سی شکلیں دماغ میں بستی چلی جاتی ہیں اور میکانکی رگ پھڑکتی ہی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بچہ کا کسی نہ کسی قسم کا مستری بن جانے کا احتمال قوی ہو جاتا ہے۔ یہ اس چھتری پر کی ہوئی مشق تھی کہ ہم نے آگے چلکر انٹرنس تک سائنس کے تجربات کئے اور بعد کو میرین انجینئرنگ کے پراسپکٹس منگائے: خود بڑے خشوع و خضوع سے پڑھے اور گھر والوں کو بھی سُنائے۔

اسی بنا پر میری مستقل رائے ہے کہ صنعتی حرفتی (ٹکنکل) مدرسوں کے ابتدائی کورس میں چھتری کا بنانا کھولنا اور بند کرنا بھی شامل ہو۔ توپ، بندوق اور چھتری کی ترکیب اور بناوٹ میں اصولی فرق کچھ نہیں بلکہ چھتری کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہی ہے، اس لئے کہ وہاں تو دھماکہ ہونے کے بعد گولہ یا گولی باہر تو نکل جاتی ہے اور

یہاں تو کھٹکا دبایا اور چھتری چھپر کی طرح اپنے ہی سر پر۔ اب اس وقت اُنگلیوں کو بچانا، سر بچانا، آنکھیں اور گال نکیلی تیلیوں کی گھرونٹے سے محفوظ رکھنا، پھر تیلیاں بھی کیسی کہ ایک بھی بیٹھ جائے تو خدا بُرا وقت نہ لگائے، آنکھ پھوڑ دے، پھر تمام جسم و ذہن کو قابو میں رکھنا اور راہگیروں سے غٹ پٹ ہوئے بغیر راستہ پر خود بھی بھلے مانسوں کی طرح چلتے رہنا بھلا اس سے زیادہ ہوشیاری کی اور کیا ٹریننگ ہوسکتی ہے؟ قوم کے ہونہار بچوں کو اب اس قسم کی مفید آسان تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ میری بات کو کسی زٹلی کی بکواس سمجھیں گے بھلا اب کون یقین کرے گا کہ بجلی پہلے پہل ایک انگریز شوقین نے پتنگ اڑانے سے معلوم کی تھی۔ خیر بتانا ہمارا کام تھا سننے والے سُن لیں کہ ع

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو

چھتری کی بھی ایک تاریخ ہے جیسے اور دنیا کی ہر چیز کی حتیٰ کہ جغرافیہ کی بھی۔ گیارھویں صدی قبل مسیح میں چین، مصر اور بابل میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ جان ہینوے (John Hanway) فارسی سیاح جب لندن اٹھارھویں صدی میں چھتری لگائے پہونچا تو اس کے پینس کے کہاروں اور قلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چھتری کو کوئی ٹوٹکا سمجھے۔ اس سے پتہ چلا کہ اس وقت تک لندن میں اس کا استعمال نہ تھا۔ علی بے نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ مراکش میں سلاطین ہی کو چھتری لگانے کا حق تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے چھتری کی بادشاہی رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھئے کہ یہاں سنگھاسن پر رام چندرجی کی کھڑاؤں کی طرح چھتری ہی کھول کر دھر دیتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ میں صرف حاکم وقت ہی چھتری لگا سکتا تھا۔ کسی دوسرے کی مجال نہ تھی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شاہانِ ہند کی سواری نکلتی تھی تو شاہی چھتر یا چھتریاں جواہرات سے جڑی بادشاہ کے سر پر سایہ کرتی جاتی تھیں۔ علاؤالدین نے رام راؤ کو رائے رایان کا خطاب عطا فرمایا اور ایک عدد سفید چھتری لگانے کی اجازت بخشی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آنجہانی (یہ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی نہیں جس کے انجن بڑے نٹ کھٹ واقع ہوئے ہیں) کو بھی ہندوستان میں آکر چھتری کے استعمال کے لئے قواعد بنانے پڑے تھے۔ کلکتہ کے بشپ ولسن کو اسکا اتنا چاؤ تھا کہ جب کبھی وہ کسی شہر کے قریب پہونچتے تو بڈھے آدمی تو ضرور تھے مگر اپنی لال رنگ کی چھتری ضرور تان لیتے تھے۔

سانچی وغیرہ (Topas) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت میں بھی چھتری بڑائی کا نشان تھا۔ ہندوؤں میں رنگین دولھا کے سر پر رنگین چھتری بھی لگائی جاتی ہے اور مندروں کے اندر بھی مورتی پر چھتر چڑھاتے ہیں۔ مرہٹے سردار بھی چھتری کو سربلندی کی علامت سمجھتے تھے۔ مہاراجہ کولہاپور اب بھی چھترپتی کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ مہاراجہ کشمیر کی راجگڈھی میں اب بھی یہ قاعدہ سُنا ہے کہ کوئی شخص ننگے سر یا چھتری کھولے ہوئے داخل نہیں ہوسکتا ورنہ سنتری للکارے گا اور تیسری بار رائفل نہ چھتیائی تو صاحب چھتری کی چھٹی

تواضع ضرور کر دے گا۔

اب اگر اس زمانہ کی کچھ یادگار باقی ہے، تو شمالی ہند کی کچہری عدالتوں میں جا کر دیکھئے، آپ اگر ذرا ڈپٹی کلکٹر ہیں تو بس جتنی بار آپ کسی ضرورت سے کمرۂ عدالت سے باہر نکلیں گے ایک چپراسی سایہ کی طرح آپ کے سر پہ چھتری لگائے آپ کے قدم ناپتا چلے گا جیسا کہ کسی منھ زور گھوڑے کی باگ ڈور تھامے کوئی چابک سوار چلے۔ اور اگر آپ کسی یتیم خانہ کے کار دھار رہیں تو بھی آپ کے سر پر چھتری کا سایہ کئے کوئی بن ماں باپ کا بچہ چلیگا۔

غنیمت ہے کہ اگلے وقتوں کی باتیں اب نہیں۔ اب تو سماج سے خودی بزرگی کے ساتھ ساتھ گدھے گھوڑے اور شیر بکری کا وہ فرق ہی اُٹھ گیا ہے۔ اب ووٹ کی طرح چھتری کے استعمال کا حق بھی ہر آدمی کو حاصل ہے بلکہ ووٹ تو صرف بالغوں کے لئے ہوتا ہے اور چھتری چھوٹے بڑے سب لگا لیتے ہیں۔ عورتیں زندگی کے ہر شعبہ میں ہرنی کی چال جا رہی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں چھتری لگانے کا چونچلا ایسا ہی ہے جیسے پوڈر اور لپ اسٹک لگانے کا۔ لیکن انوکھی بات یہ ہے کہ آپ کسی نیک بخت کو وہ پوری بڑی چھتری لگائے نہ دیکھیں گے جو مردوں کے لئے پڑتی ہے۔ عورت یہاں بھی انجان پن میں اپنی فطری کمزوری کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کی چھتری بچکانہ قسم کی، سانپ کی کھمی یا بے راگ کی ڈفلی سی ہوتی ہے۔ ان زنانی چھتریوں کے رنگ تو اتنے ہی ہیں گے جتنی کہ دنیا کی زنانی مردم شماری ہے مگر ایسی چھتریوں کے لگانے کا کچھ سکھ نہیں۔ اس کا سایہ شاید محترمہ کے سر تک بھی ایسا ہی پہونچتا ہوگا جیسا کہ گرمی میں گرم چائے کسی خوش اعتقاد "اشتہاری" پینے والے کو ٹھنڈک پہونچائے۔ ان عورتوں کی مثال اس شتر مرغ کی سی ہے جو ریت میں اپنی چونچ چھپا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرا سارا جسم چھپ گیا۔ بھلا جس حوّا کی بیٹی سے چلمن کی تیلیوں کو چھوڑ کر اب چھتری کی تیلیاں بھی نہ سنبھلیں وہ کیا خاک ہم مردوں کی برابری کرے گی اور قربانیاں دے گی؟

مدرسوں کے طالب علموں کو چھوڑ کر جن کی بہت سی موسمی چھٹیاں ایک چھتری کے ہونے سے ماری گئیں ساری دنیا باوجود قیامت خیز اختلافات کے ایک آواز ہے کہ چھتری بڑے کام کی چیز ہے یعنی بالفاظ دیگر بین الاقوامی اتحاد کی واحد کڑی ہے سال کے تین سو پینسٹھ دن اس کا استعمال کہیں نہ کہیں رہتا ہی ہے بالکل اسی طرح جس طرح عروس البلاد بمبئی میں بلجی تربوز بارہ مہینے بکتا ہے اور اس کے نوش فرمانے والے بھی بافراط ملتے ہیں چھتری کے کیا کیا فایدہ گناؤں، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سوائے فایدہ کے اس سے نقصان تو بیس بیس کوس تک نہیں یہ میں نے روزمرہ میں بات کہی آپ اسے پورے بیس کوس ہی نہ سمجھئے۔ برسات میں اسکی مانگ ایسی زبردست ہے جیسی کہ خود مانسون کی۔ امیر خسرو کی پہیلی یاد آگئی ہے

چار مہینے بہت چلے، آٹھ مہینے تھوری
امیر خسرو یوں کہیں، بتا پہیلی موری

بتائیے کیا ہے؟ یہی چھتری! اس کے علاوہ سرکسوں میں کبوتریاں اس کی امداد سے بدن سادھ کر ڈور پر ایسی تھرکتی جاتی ہیں جیسے کوئی مولوی پل صراط پر سے گزرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ بعض اوقات چھتری جادو کی ٹوپی کا کام کرتی ہے، چھتری لگا لیجئے تو قرض خواہ آپ کا منھ نہیں دیکھ سکتا اگر آپ ذرا قابلیت سے سڑک پر چلیں۔ پھر کسی مجمع سے گزر جائیے ایک چھتری والے کی چیر پھاڑ سے کائی سی پھٹتی چلی جاتی ہے۔ لوگوں کے سروں پر ٹھونگیں مارتے، بنی بنائی مانگیں بگاڑتے چلے جائیے، لوگ خود زمانہ کی نزاکت پر غور کرتے اپنی مدد آپ کے اصول پر اپنے ہیٹ اور ٹوپیاں دونوں ہاتھوں سے تھامے ہٹتے چلے جائیں گے۔ آپ کے ہاتھ میں چھتری نہیں گویا قانونِ حق آسایش اور تعزیرات ہند آپ جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔

لندن میں ٹھگی کی ٹھیکہ دار عورتیں دوکانوں سے چیزیں اُچک اُچک کر اپنی معصوم چھتری میں ڈالتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں رومال سوئیاں فیتے اور بیل چکن بیچنے والے اپنی دوکان چھتری ہی میں بھنڈیلے کی پالکی کی طرح سجائے پھرتے ہیں، دوکان کی دوکان، چھتری کی چھتری۔ یقیناً چھوٹی پونجی والوں کے لئے چھتری کاروبار کی جان ہے!

جب آپ کو کوئی گہری گفتگو کرنا ہو مثلاً آپ کے بھائی بند جمہوری طریق پر اس بات کی پنچائت لائے ہوں کہ آپ کو معہ آپ کی چہیتی اولاد کے کنوئیں میں ڈھکیل دیں یعنی کوئی منگنی وغیرہ کا سلسلہ ہو جائے، اور اس ہنگیری وقت میں آپ بغلیں جھانک رہے ہوں۔ کچھ بات بنائے نہ بنے، نہ موسم کی نہ بے موسم کی۔ تو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ اگر آپ کے پاس چھتری ہے تو آپ نے پالا مار لیا۔ آپ اپنی چھتری سنبھالئے اور اس طرح ستیا گرہ شروع کیجئے کہ بند چھتری کی نوک سے زمین کریدنی شروع کر دیجئے نیچی نگاہ کئے ہوئے۔ پھر دیکھئے کیا معنی کہ آپ مضمون اُٹھا کر نہ لائیں؟ اور کچھ نہیں تو آپ کا یہ عمل ہی بجائے خود دوسرے فریق کو الجھن میں ڈال دے گا۔ مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ چھتری کی انسانی دماغ یا دماغ کے گودے سے کچھ نامعلوم نسبت ضرور ہے جو ایسی ہی ان دیکھی ہے جیسی کہ ریڈیو کی لہریں یا پانی کی ایک بوند میں رہنے والے ، لاکھ کیڑے۔ مگر میری پیشین گوئی ہے کہ اب نہیں تو ۲۰ لاکھ ۲۶ ہزار سال کے بعد تو ضرور اس رشتہ کو انسان کھلی آنکھ سے دیکھ لیگا۔ میں اس پر (Thesis) تیار کر رہا ہوں اور اس کا دیباچہ (Foreword) بھی اتفاق سے میں نے خود ہی لکھ لیا ہے، البتہ اس پر دستخط کسی بڑے آدمی سے کرانے ہیں۔ واضح رہے کہ میں عمر یا عقل کی بڑائی کا قایل نہیں۔

ابھی پچھلے دنوں میونخ کا جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اگرچہ چار یوربی طاقتوں کے نمایندے تھے وہاں ایک چھتری بھی پانچویں سوار کی طرح موجود تھی۔ مسٹر چیمبرلین کو اپنی چھتری اسی قدر چہیتی ہے جس قدر کہ ملک و قوم غور کیجئے کہ وہ وقت کتنا نازک تھا لیکن وہ بندۂ وفا چھتری کو نہ بھولا اور بغل میں تصویر جاناں کی طرح لگائے لایا

حقیقت یہ ہے کہ بظاہر میونخ میں ایک دوسرے کے منہ نوچنے کا سامان ہوگیا تھا اور دنیا ہوا پر کان لگائے پنجوں کے بل کھڑی تھی۔ مجھے ان دو دن دھڑکا ہی لگا رہا کہ ہر ہٹلر جیسا بے تکا آدمی جو داہنی طرف مانگ نکالتا ہے مسٹر چیمبرلین کا ایک ہاتھ خالی اور دوسرے میں چھتری دیکھ کر کہیں یہ نہ سمجھے کہ ایک آنکھ ملنے اور ایک لڑنے کی لیکر آئے ہیں اور اسی بات پر تخفیف اسلحہ پر راضی نہو۔ ان دو دن میرے نزدیک چھتری کی اہمیت وہی تھی جو صدہا جنگی جہازوں اور آبدوزوں کی ہوسکتی تھی کیونکہ اس پر ہی امن عالم کا انحصار تھا۔ بارے شکر ہے کہ بات آئی گئی ہوئی اور مسٹر چیمبرلین ہنسی خوشی واپس لندن پہونچے۔ مسٹر چیمبرلین کا چھتری سے یہ عشق دیکھ کر انگلستان والے انھیں چھتری والا وزیر اعظم کہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے چھتری کا اقبال!

چھتری بعض اوقات خطرناک تو ہو جاتی ہے "اہمسا پرمو دھرم" کے نزدیک تو اس کو پاس رکھنے سے شکتی کمزور ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی کے چھتری رسید کر دیجئے تو اچھا خاصہ تنازعہ کھڑا ہو جائے اور شانتی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ چھتری کے مارنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ وہی ہے جو سنگین کرچ یا گپتی کے مارنے کا، یعنی سیدھا چھتری کی موٹھ کو پکڑ کر مخالف کے معدہ یا کوڑی پر ہول مارئے۔ پھر دیکھئے کیا لطف آتا ہے، ایک کی خیر نہیں، آپ کی یا آپ کی چھتری کی۔ تعجب ہے کہ جہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہوتی ہے وہاں پولیس والے راہ چلتوں سے لاٹھیاں اور قمچیاں تو چھین چھین کر پولیس چوکی میں، بانس منڈی لگا لیتے ہیں مگر چھتری والوں سے نہیں اُلجھتے۔ اُلجھیں کیسے؟ پبلک کی چھتریوں کے خنکے اپنے پیٹ میں کون لگوائے؟! اور پیٹ بھی وہ جس کے پالنے کے لئے یہ دنیا کے دھندے کئے جاتے ہیں!!

چھتری یاد رہنے کے مقابلہ میں بھولتی زیادہ ہے، یعنی اس کا بھول جانا زیادہ یقینی ہے بہ نسبت یاد رہنے کے۔ ذرا آپ نے دو منٹ کسی جگہ بیٹھ کر بات کی اور یہ ذہن سے خارج ہوئی۔ لوگ شاید اسے کھونے ہی کے لئے خریدتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ چھتری اور محبت دونوں کام کی چیزیں ہیں مگر دونوں کے سودے میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جبھی تو یہ بات ہے کہ انشورنس کمپنیاں ایکٹرسوں کی پنڈلیوں ایکٹروں کی عینکوں تک کا بیمہ کر رہی ہیں مگر نہیں کرتیں تو کسی چھتری کا بیمہ۔

مضمونوں کے چرانے والے سرکاری دفتروں میں اور جوتوں کے چرانے والے مسجدوں تک میں ملتے ہیں مگر علم وگیان اور چھتری کے سچے اور حقیقی چور کہیں نہ ملیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی عقل اور دوسروں کی دولت تو ہمیشہ یاد رہتی ہے مگر دوسروں کی نیکی اور اپنی چھتری مشکل سے ہی یاد رہا کرتی ہے۔ چھتری تو خود ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ مجھے تو اتنا وہم ہوگیا ہے کہ ہر وقت کھٹکا ہی لگا رہتا ہے کہ موت کے آنے کا اور چھتری کے گم ہو جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ چھتری کو بار بار ٹھنڈی سانس بھر بھر کر دیکھا کرتا ہوں کہ یہ تو مہمان ہے جیسے جھابے کی چڑیاں

یا بیلے کی کلیاں - یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ اس کے بھتے ہوئے میں کسی سے بات نہیں کرتا کہ دھیان بٹ جائیگا دم بھر کو غافل ہوا اور اسے کھویا - مگر ہوتا بھی یہی ہے کہ ٹریم یا ریل پر سوار ہوتا ہوں تو ماشاء اللہ چھتری اور میں دونوں ساتھ ہوتے ہیں مگر جب اُترتا ہوں تو میں واحد حاضر، چھتری واحد غائب، اور میرا ضمیر متکلم، مجھے میری بھول پر بُرا بھلا کہتا ہوا - اسوقت کیسا دل کڑکڑ کرتا ہے اور وہ اُس کی جرمنی کمانی کی تیلیاں محراب نما، وہ سیاہ غلاف وہ اس کے اندر ملتانی سے چھپے ہوئے حروف کی لکھت، چاندنی چوک والے نور محمد صاحب یا بمبئی کے ابراہیم کریم کی ہرن چھاپ کی مہر کئی کئی روز نگاہوں میں کلیلیں کرتی پھرتی ہے، ہاں وہ کتبہ جسے میں چھتری کی چھاؤں میں پڑھتا، فلسفۂ حیات، شہرت عام اور بقائے دوام پر غور کرتا چلا کرتا تھا!

چھتری میں رومان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے " دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے؟" چھتری، بند ہو تو کنول کا پھول کمھلایا ہوا (رنگ کا آپ خیال نہ کیجئے) کھلی ہو تو کٹورا گلاب کا شاخ گل پر کھلا ہوا - جب برسات آتی ہے، جب ساون کی ٹھنڈی پون جھکولے کھاتی چلتی ہے، جب تمامی فطرت پر جوبن ہوتا ہے، جب آکاس سے امرت برستا ہے، جب کلیاں مسکراتی ہیں، پھول کھلتے ہیں، جب کوئل کوکتی ہے اور پپیہا 'پی کہاں' 'پی کہاں' کی رٹ لگاتا ہے، جب آپ بے اختیار مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم میرٹھی کو یاد کرکے پکار اُٹھتے ہیں کہ

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا　　کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

تب نظیر اکبرآبادی کی روح آپ کے کان میں آکر پھونکتی ہے کہ او میاں "اب دیکھ بہاریں چھتری کی! تو پھر آپ دیکھئے، اُدھر آسمان پر کالے بادلوں کے پرے، اِدھر زمین پر کالی، سفید، نیلی، ارغوانی، بسنتی، چمپئی اور دھانی غرض رنگ برنگ کی چھتریوں کے جھرمٹ - ہر چھتری مکمل شعر، مکمل شعور - اس کی تیلیاں نگاہوں کے تیر، اس کی کمانی کیوپڈ کی کمان، کمانیوں کا خم، خم ابروئے بتاں، اس کا کپڑا پیراہن صد چاک، شام غم کی سیاہی اور داغ جگر کا رنگ اس میں موجود، یہ خود آبلۂ دل کا مرقع، پیر فلک کی ملتی جلتی تصویر، محمل لیلیٰ کا نقشہ، بگولوں کا ہیولیٰ، ارے صاحب! چھتری تو گویا ہے، غزل ہے - بھلا اسے کھولکر لگائیے اور ڈھارس نہ بندھے، دل نہ بہل جائے، نہیں بلکہ طبیعت شعر کہنے پر مایل ہو جاتی ہے اور راستہ ایسے کٹ جاتا ہے جیسے کسی مشاعرہ میں بیٹھے ساغر نظامی کی تانیں سُن رہے ہوں - چشم بد دور یہ چھتری تو ہماری موجودہ شاعری کا ایوان ہے - میں تو سمجھتا ہوں کہ چھتری کے متواتر استعمال سے ہر پڑھا لکھا خیر شعر سمجھے یا نہ سمجھے یہ تو خداداد بات ہے، مگر شعر کہنے ضرور لگتا ہے!

یہ دیکھا گیا ہے کہ چھتری کو دیکھ کر ہندوستانی مویشی ایسے ہی بھڑکتے ہیں جیسے اٹھارھویں صدی میں لندن کے لوگوں کی حالت تھی - ہم نے ان کی اس کمزوری سے بھی فایدہ اُٹھایا ہے - جب میں اپنے وطن جایا کرتا ہوں جو اک گاؤں ہے (گاؤں آپ سمجھ لیجئے اب وہ جگہ ہوتی ہے جسے اُجاڑ کر شہر بسایا جاتا ہے) تو گاڑی بان

کو کرایہ تو میں گھر پہونچکر نقد دیتا ہوں اور چھتری وہ مجھ سے راستہ میں قرض مانگ لیتا ہے جسے وہ خود نہیں لگاتا بلکہ جوئے پر بیٹھے بیٹھے گاڑی کے بیلوں کو اس کے درشن کرا دیتا ہے۔ دو تین مرتبہ یہی عمل کرنے کے بعد کایا پلٹ ہی ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیلوں کو تو کسی گے او کا سایا شدہ مکر دھوج کی ڈبل خوراک کھلادی اور مجھے کوئی باؤ بڑنگ پلا گیا اس لئے کہ چھتری کو دیکھ کر بیل بُری طرح بھاگتے ہیں اور پان چباتے میں چھکڑی کے اندر سر پیر پٹکتا اُچھلتا سنبھلتا ایسا چلا جاتا ہوں جیسے جامنیں کسی بادیۂ بزرگ کے اندر۔

میں کل ایک دوست کے ہاں گیا۔ یہ صاحب ڈاکٹر مویشیان کی ڈگری لینے سری نگر سے بمبئی انٹر کلاس میں بیٹھ کر آئے ہیں۔ میں نے ازراہ کسر نفسی اُن کی کتاب اُٹھا کر جو دیکھا تو اس میں ایک انگریز مصنف نے لکھا تھا کہ گھوڑے کو ہاتھ لگانے سے پہلے اپنی چھتری ضرور بند کرلو۔ میں اُچھل پڑا کہ دیکھئے جو بات ہم نے بیل کی نسبت سمجھی ہے وہی ایک انگریز گھوڑے کی نسبت کہہ رہا ہے۔ ہم میں اور اس میں بس یہی فرق ہے کہ ہمارا دماغ بیل کی طرف گیا اور اس کا خیال گھوڑے پر پہونچا۔ سو ہر ملکے وہر رسمے، اس سے کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ ہم نے ان صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ امتحان میں گھوڑے کی جگہ بیل ہی کو لکھئے، تعلیم میں بھی سودیشی شان رہے تب ہی تو بات ہے!

صاحب موصوف نے کان کھڑے کئے، منھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سر نیہوڑا لیا میں اسکا مطلب نہ سمجھا۔

چھتری پر مضمون ختم کرنے سے پہلے برساتی کا ذکر نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ دنیا کی تجارت کا ذکر کرنا اور جاپان کو بھول جانا، آجکل چھتری کے مقابلہ میں اک چیز چلی ہے جسے برساتی کوٹ کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ بھی کام کی چیز ہی، ہوگی۔ مگر میں تو جب کسی برساتی کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے۔ مجھے تو یہ ایک آنکھ کیا دونوں آنکھوں سے بھی نہیں بھاتی۔ وہ اس کی ربڑ کی چپچپاہٹ، اُس میں پلیگ کے چوہوں کی سی بو بسی ہوئی، دیکھنے میں بیلوں کی سی جھول، اک اسباب جہالت یعنی ٹرٹیسی کمپین (تعلیمی جہاد) والوں کے لئے ایک مستقل خطرہ۔ صاحب، یہ برساتی تو ہماری اس تہذیب کا جوئے دیگر اب چھتری میں چھپی رہ گئی ہے کفن ہے، جنازہ ہے۔ اس کے پہننے والے کو دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا گریبان پکڑ لوں اور کہوں کہ "اے مورکھ نادان، تو تو گیا ہی مگر اس آخری یادگار سلف کو بھی اپنے ہمراہ لئے جا رہا ہے۔ دیکھ تو سہی کہ قوم پر کیا وقت پڑا ہے!"۔ میں اس باب میں دقیانوسی خیال کا آدمی ہوں۔ میرے نزدیک یہ ایسا اہم سوال ہے کہ جس پر میں کونسل کا ممبر بن سکتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ مجھ سے حلف ناموں کی زنجیر پاؤں میں نہیں ڈالی جاتی میں تو آزاد ہوں میرا مسلک زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔ لیگ آف نیشنز کو بھی متوجہ کر سکتا ہوں جو آجکل ویسے بھی کام نہونے کی شاکی ہے۔ لیکن میں اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ نام و نمود نہیں چاہتا، ہاں رسایل و ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ خاموش کام کرنے سے مجھے عار نہیں۔

فضل احمد صدیقی بی۔ اے

ادب اور اس کے مقاصد

رسالہ "نیا ادب" کے پہلے نمبر میں جناب لطیف الدین احمد کا ایک مضمون۔ "ہمارا ادب اور زمانے کا تقاضا" شایع ہوا ہے۔ میں اپنے پیش کردہ عنوان کی بنیاد لطیف صاحب ہی کے مضمون پر رکھنا چاہتا ہوں۔ مندرجہ ذیل سطور ان کے مضمون کا خلاصہ پیش کرتی ہیں :-

(۱) آرٹ کی بنیاد حقیقت نگاری پر ہونی چاہئے چنانچہ ایسے ادب کو جس کے اندر عام قومی عادات و خصایل نظر نہ آتے ہوں سچا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اور کلچر ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں۔

(۲) ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے لئے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان کی زبان عام فہم اور سلیس ہو تاکہ عوام میں تہذیب اور مدنیت پھیل سکے اور ان کے کلام کے موضوع عوام کی زندگی سے لئے گئے ہوں۔

(۳) زندگی ہر جگہ حسین ہے تو پھر کسان اور مزدور ہی ہمارے موضوع کیوں نہ بنیں۔

(۴) ہمارا موجودہ ادب ایک ڈھرے پر چل رہا ہے جس کا مقصد "ذہنی عیاشی" کے سوا اور کچھ نہیں۔

زمانہ کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ لطیف صاحب کے قیام کردہ اصول حسین اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ "حسن" سطحی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر لطیف صاحب یہ سب باتیں کہنے سے پہلے "ادب" کے مفہوم پر غور کر لیتے تو ان کے اصول دوسرے ہوتے۔ ادب کیا ہے؟ یہ سوال پوچھا بہت مرتبہ جا چکا ہے لیکن عام رائے یہ ہے کہ اس کا صحیح جواب ابھی کسی نے نہیں دیا۔ مجھے اس گمان سے اتفاق نہیں۔

میں نے اپنے ایک انگریزی مقالے میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

Literature is an aesthetical embodiment of what man thinks and what he experiences.

یعنی ادب انسان کے خیال و تجربہ کی جمالیاتی تصویر ہے۔ ادب کو زندگی کی تصویر بھی کہا جاتا ہے لیکن ادب کو "جمالیاتی تصویر" بنانے سے میرا مدعا یہ تھا کہ اس کی حد سے امپیریل بینک کے کھاتے یا ڈاکٹروں کے نسخے یا بائیسکوپ کے اشتہارات یک لخت خارج ہو جائیں حالانکہ یہ چیزیں بھی زندگی میں شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرٹ یا ادب

کی بنیاد "زندگی" پر ہونی چاہئے۔ گوئٹے نے بہت خوب کہا ہے:-

"Man is properly the only object that interest man"

یعنی انسان ہی انسان کی لازوال دلچسپیوں کا مرکز ہے۔ لیکن یہاں بھی ہمیں یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ ادب کیمرے کی تصویروں کی لفظی تشکیل نہیں ہے۔ بلکہ آرٹ ہی کی ایک صورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ آرٹ "مصنوعیت" (Artificiality) کے الزام سے یک لخت بری نہیں رہ سکتا۔ آرٹ فطرت کی تصویر ہے لیکن اسکی فطرت وہ فطرت ہے جس پر باغبان کی قینچی چل چکی ہے اور اس کی زندگی وہ زندگی ہے جس کی کثافتوں پر بھی قوس قزح کا عکس پڑ چکا ہے۔ یہی سب کچھ ادب کے باب میں بھی پورا اترتا ہے۔ مدعا یہ عرض کرنا ہے کہ آرٹ یا ادب کی حقیقت بینی یا حقیقت نگاری سطحی نہیں ہے۔ جناب لطیف نے ادب کی حقیقت نگاری میں جو چیزیں شامل کی ہیں وہ بڑی حد تک عارضی اور رفتار زمانہ کے ساتھ تبدیل ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ ادیب کی نگاہ ان حادثات پر صرف نہیں ہوتی بلکہ انسانی فطرت کے ان اٹل پہلوؤں سے واسطہ رکھتی ہے جو ازلی و ابدی ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ ایسے ادب کو جس کے اندر عام قومی عادات و خصائل نظر نہ آتے ہوں سچا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ سوائے کوتاہ بینی کے اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ قوم و قومیت کا تخیل یوں بھی بے حد ناقص چیز ہے۔ آج جبکہ علم اور سائنس نے انسان کو انسان سے جدا رکھنے والی ہر دیوار توڑ دی ہے، ہمارا قوم و قومیت کے گیت گانا وقت کے تقاضوں کے موافق نہیں بلکہ خلاف جاتا ہے۔ قوم و قومیت کا تصور صرف اسی حد تک مستحسن ہو سکتا ہے جب تک اس کا مقصد یہ ہو کہ ایک جماعت اپنی جگہ مکمل بنکر دوسری ترقی یافتہ جماعتوں میں اس شان سے وصل ہو جانے کے لئے طیار ہو جائے جس طرح پتی پتی ملکر پھول بنتا ہے۔ جس قوم پرست کا یہ مقصود نہیں وہ سیاسی طور پر خواہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ کیونکہ خالص انسانیت کی روایات سیاست کو کامیاب نہیں بنا سکتیں۔ انسانیت کہتی ہے گاندھی بنکر دشمنوں کے لئے بھی دعا مانگو۔ سیاست کا تقاضا ہے کہ ہٹلر کی طرح دوستوں کو بھی گولی مار دینا چاہئے۔ ادب اور زمانہ کا رشتہ مسلم لیکن ایک دوسرے کو لازم و ملزوم بنانا صریح غلطی ہے۔ زمانہ کے تاثرات ادب کو فیض نہ پہونچا سکیں یہ ممکن ہے لیکن زمانہ بغیر ادب کے اپنی عمر پوری نہیں کر سکتا۔ اس لئے ادب زندگی کی تصویر ہو یا نہ ہو لیکن زندگی کی ایک شرط ضرور ہے۔ عہد حاضر ہی کے کسی نوجوان انگریز ادیب یا شاعر کا قول ہے:- "Science saves us from death Literature saves us from life" یعنی سائنس ہمیں موت سے محفوظ رکھتی ہے اور ادب زندگی سے ممکن ہے میں نے ان الفاظ سے آپ کو چونکا دیا ہو لیکن میری استدعا پر ذرا غور کیجئے اور آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الحقیقت ڈرنے کی چیز موت نہیں ہے بلکہ زندگی ہے اور ادب اگر ادب ہے

تو اس کا سب سے پہلا فرض یہی ہونا چاہئے کہ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم چند لمحوں کے لئے ہی ہمیں زندگی کے بار سے نجات دے اور انسانی بیچارگیوں کا غم بھلا دے میری اس بحث سے مدعا یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ میں ادب کو محض ایک "فریب وہم وخیال" بنانا چاہتا ہوں۔ ادب کی سب سے بڑی قوت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے اسرار کو سلجھانا چاہتا ہے اور کائنات کی منشائے تخلیق سے بحث کرنا چاہتا ہے نہ کہ امتیازات رنگ و بو سے۔ فختے (Fichte) کا غالباً یہی مدعا تھا جب اسنے ادب کو (Continuous revelation) یعنی الہام مسلسل کہکر پکارا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ ادب زندگی کی ان حقیقتوں سے واسطہ نہیں رکھتا جو (حقائق Facts) کہلاتی ہیں بلکہ ادب کی دنیا (Ideals) کی دنیا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ (Ideals) کو دیوانے کا خواب نہیں کہہ سکتے۔

جناب لطیف نے ادب کو کلچر کا آلہ قرار دیا ہے۔ لیکن میرا یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ کلچر بجائے خود کسی مستقل چیز کا نام نہیں ہے۔ کلچر نام ہے ایک روحانی اور ذہنی ترقی و حرکت کا، میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں کلچر نام ہے (Light + sweetness) کا اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چیز جو "حسن" کہلاتی ہے کس درجے پر پہونچکر مکمل ہو سکے گی؟ اس لئے ادب کو کلچر کا آلہ کہنا بھی کوئی زیادہ صحیح بات نہیں ہو سکتی۔ ادب کے پروگرام میں تعمیر کا وہ حصہ جو پروپیگنڈا سے ملحق ہے کبھی شامل نہیں ہو سکتا۔ ادب صرف فضائی کیفیات پیدا کر سکتا ہے اور بقول منشی پریم چند مرحوم "شعر و ادب کا منشاء ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے" اور فی الحقیقت احساس کی شدت کا تیز ہونا ہی تعمیر کا مرادف ہو سکتا ہے نہ کہ "عام قومی عادات و خصائل" کی آئینہ داری۔ رسکن کے اس قول کی صداقت کا اندازہ — We are only human in so far as we are sensitive, and our honour is precisely in proportion to our passion. شیلے کے اس بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے لگانا چاہئے۔ A man, to be greatly good, must imagine intensely and comprehensively, he must put himself in the place of another + many others.

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعمیر کے فرائض وعظ و تقریر سے زیادہ بیداری تخئیل سے ادا ہو سکتے ہیں اور تخئیل کی اساس (Idealism) پر ہے نہ کہ ان چیزوں پر جو کہ ہمارے سامنے ہیں اور وقتی و اعتباری ہیں۔

چونکہ لطیف صاحب کا مقصود یہ ہے کہ ادب عوام کے لئے عمرانیت کی درس و تدریس کا آلہ یا ذریعہ

بن سکے اس لئے ان کا یہ کہنا زیادہ تعجب خیز نہیں کہ ہماری زبان کو لازمی طور پر "عام فہم اور سلیس" ہونا چاہئے۔ لیکن جس طرح جناب لطیف اپنے مضمون کے ابتدائی حصے حقیقت نگاری پر بحث کرنے سے پہلے آرٹ کی حقیقت کو نظر انداز کر گئے تھے اسی طرح وہ زبان کے عام فہم اور سلیس بنانے کی جستجو میں خیال و زبان کے باہمی رشتے کو بھولنا چاہتے ہیں۔ فلاطوں کا یہ دلچسپ عقیدہ تھا یعنی "خوبصورت یا حسین روح اپنے لئے ہمیشہ خوبصورت جسم تلاش کرتی ہے"۔ فلاطون کا یہ اُصول انسان کی زندگی پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن خیال و زبان کے معاملہ میں ہمیشہ صحیح اُترے گا۔ الفاظ و زبان یک لخت خیال و تخئیل کے محتاج ہیں۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ کوئی شاعر یا ادیب الفاظ سے کھیلنے بیٹھا ہو اور کسی نتیجہ پر پہونچا ہو ادب میں مقدم چیز تخئیل ہے اور ہر تخئیل کے لئے الفاظ و زبان میں ایک نئی ہم آہنگی پیدا کرنی پڑتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو تنقیدِ ادب کے باب میں وہ چیز جو اسلوب بیان یا اسٹائل (Style) کہلاتی ہے مہمل ہو کر رہ جائے۔ ممکن ہے کہ آپ ڈرامہ، ناول اور افسانوں میں زبان کو ایک حد تک حسب منشاء موڑ لیں لیکن اس ادب کے ساتھ آپ کا کیا سلوک ہوگا جو فلسفیانہ یا تاریخی نوع کا ادب ہے؟ اس کے علاوہ شاعری میں یہ چیز قطعاً غیر ممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔ فانی کے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نشناس ۔۔۔ وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار ۔۔۔ نہ موجِ بوئے گل اُٹھتی نہ آشیاں ہوتا

بتائیے فانی کا مفہوم عام فہم الفاظ میں کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ اس کے خلاف شاد کے دو شعر لیجئے۔

یونہی راتوں کو تڑپیں گے یونہی جاں اپنی کھوئیں گے ۔۔۔ تری مرضی نہیں اے دردِ دل اچھا نہ سوئیں گے

اکڑ لے اے شبِ غم چند دن اپنے ستانے پر ۔۔۔ یونہی دیکھے گی تو اور سونے والے خوب سوئیں گے

اس مفہوم کے لئے بھی زبان موزوں ہے۔ یہاں تخئیل میں ایک مسکینی ہے جو سادہ زبان کے جامہ میں ناگوار نہیں گزرتی۔ اسی تخئیل کو مرعوب کن الفاظ میں ادا کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ شاعری سے انتقام لیا جا رہا ہے۔ مدعا یہ عرض کرنا ہے کہ کسی شاعر کی زبان اس کی خود اختیار کردہ نہیں ہوتی۔ اصل چیز تخئیل ہے جو اپنے حسب منشا اپنے لئے نامعلوم طور پر الفاظ کا جامہ اختیار کر لیتی ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ الفاظ کی مشکل رفع ہو سکتی ہے تو بھی اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ عبارت میں آسان الفاظ استعمال کرنے سے آپ کا ادب عام فہم ہو جائے گا۔ لطیف صاحب نے اپنے مضمون میں "رشتے، جنتا، سبھا" وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن مجھے یہ کسی طرح یقین نہیں آسکتا کہ ان کا مضمون عام فہم ہے۔ کوئی ادیب "جو بولو وہ لکھو" کے اُصول پر کاربند نہیں ہو سکتا۔ اس کا اصول تو "جو سوچو وہ لکھو" ہوتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس ادیب یا شاعر کے ذہن میں کس وقت کیا خیال آئے گا اور وہ خیال کن الفاظ کا جامہ اختیار کرے گا۔ جو اقبال ایک وقت اپنی نوعیت

تخئیل کی مناسبت سے یہ زبان استعمال کرتے ہیں:۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو،
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہی اقبالؔ دوسرے وقت یہ تخئیل اور یہ زبان پیش کرنے پر مجبور ہیں:۔

وہ چشم پاک ہیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگرتابی
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

لطیف صاحب نے عام فہم زبان کے متعلق جو تجویز پیش کی ہے وہ کوئی نئی تجویز یا تحقیق نہیں ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں ورڈسورتھ اپنی تمام ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاکر سادہ زبان اور موضوعات شعر و ادب کے متعلق سب کچھ یہی کہہ چکا ہے جو آج لطیف صاحب فرما رہے ہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ کولرج نے کس خوبی سے ورڈسورتھ کی تجاویز کے نقص بے نقاب کئے ہیں۔

زبان کے بعد سوال "موضوعات" کا رہ جاتا ہے۔ لطیف صاحب کا خیال ہے کہ جب زندگی ہر جگہ حسین ہے تو پھر کسان اور مزدور ہی ہمارے موضوع کیوں نہ بنیں، سب سے پہلے دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا زندگی واقعی ہر جگہ حسین ہے؟ اس سوال کا سب سے زیادہ مناسب جواب وہ لوگ دے سکیں گے جو کشمیر ہو آئے ہیں ایک طرف برف پوش چوٹیوں کے دامن میں رنگ و نور کی وہ جنت ہوتی ہے جسے دیکھ کر انسان میں فرشتوں کی سی قدوسیت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف وہ بھیانک مناظر جو انسان کو آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیں۔ یہ دونوں عالم ایک دنیا میں ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی ہر جگہ حسین ہے۔ مجھے اسپتالوں کی زندگی سے کافی واقفیت ہے دل ہل جاتا ہو جب کوئی غریب درد سے کراہتا ہے۔ کیا یہ زندگی حسین ہے؟ کبھی پوسٹ مارٹم جا کر دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا واقعی زندگی ہر جگہ حسین ہے؟ اسی سلسلہ میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ "کسانوں اور مزدوروں کی زندگی" کس حد تک حسین ہے؟ میں تو یہی کہوں گا کہ کسی حد تک بھی نہیں۔ کیا جہالت حُسن ہے؟ کیا بیجا مشقت حسن ہے؟ کیا بدبودار میلے کپڑے سامانِ حسن ہیں؟ یا غم زدہ نگاہیں اور گرد آلودہ جبینیں حسن ہیں؟ اس بحث سے میرا مدعا یہ نہیں کہ آپ کے کسان اور مزدور، ادب کے موضوع نہیں بن سکتے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ادب زندگی کی تصویر ہے اور ظاہر ہے کہ زندگی کی حدیں کسانوں اور مزدوروں کی زندگی پر ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس لئے وہ لوگ سراسر غلطی پر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو قطعی طور پر "کسان مارک" یا مزدور برانڈ بنا رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اور مطمح نظر بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ غلط ہے کہ جو آپ کے مزدور کو "دیوتا"، یا کسان کو "پیغمبر" نہ بنائے اس کی شاعری شاعری نہیں ہے۔ ایک حقیقی شاعر کی

نگاہ ذرات رہگذر سے لیکر عقد ثریا تک بیدار رہتی ہے۔ وہ جھونپڑی کے ساتھ محل اور علم کے ساتھ جہالت نہیں بھول سکتا۔ اسی باب میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ لطیف صاحب ایک طرف تو ادب کو عمرانیت کا آلہ بنانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف موضوعات شعری میں اکثر طور پر کسان اور مزدور شامل کرنا چاہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسان اور مزدور عمرانیت یا کلچر یا تہذیب کا کوئی معیار بھی پیش کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس گفتگو کا حاصل؟ کبھی ورڈسورتھ نے بھی "Idiot boy" Michael. Leach gatherer" وغیرہ کو عارفوں کا درجہ دے کر فرشتہ بنانا چاہا تھا۔ لیکن کیا دنیا اس سے اتفاق کر سکی۔ یہ بات اور ہے کہ آپ دنیا کی ہر کسوٹی کو جھوٹا سمجھیں۔ ٹامس ہارڈی نے اپنے (Wessex novels) میں دیہاتی اور دیہاتی زندگی جس کمال سے پیش کی ہے اس کا جواب نہیں مل سکتا لیکن کیا آپ اس کے ناول پڑھکر کہہ سکتے ہیں کہ ہارڈی کی عکاسی صحیح عکاسی ہے یا اس کا فلسفہ زندگی کا صحیح فلسفہ ہے۔ چارلس ڈکنس نے اپنی عمر ختم کر دی لندن کی زندگی کا بدنما پہلو دکھانے میں لیکن دنیا جانتی ہے کہ زندگی یکسر کرب و اضطراب بھی نہیں ہے۔ چنانچہ تھیکرے کی آج قدر ہی اس وجہ سے ہے کہ اس نے زندگی کے رنگین پہلو پر اپنا آرٹ صرف کیا۔

لطیف صاحب ہمارے موجودہ ادب سے بہت بدظن معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں "ہمارا موجودہ ادب ایک ڈھرے پر چل رہا ہے جس کا مقصد ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں" کوئی شخص جو موجودہ ادب اُردو کی رفتار ترقی سے ذرا بھی واقف ہے لطیف صاحب سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ موجودہ اُردو ادب میں اس قدر تنوع پیدا ہو چکا اور موجودہ ادب اس قدر دلچسپیوں کا حامل ہوتا جا رہا ہے کہ تاریخ میں مثال مشکل سے ملے گی۔ اگر مضمون نگاری مولانا شررؔ کے قائم کردہ خطوط سے اختلاف نہ کرتی۔ اگر ناول نویسی میں نذیر احمد کے بعد مرزا رسوا پیدا نہ ہوتے۔ اگر تنقید حالی یا شبلی سے آگے نہ بڑھتی۔ اگر فسانہ نگاری سرشار پر ختم ہو جاتی۔ اگر شاعری اب بھی قصیدہ، رباعی، مرثیہ، غزل تک محدود رہتی تو یقیناً وہ "ڈھرے پر چلنا ہوتا"، موجودہ شاعری میں اگر کوئی چیز "ڈھرہ" بن چلی ہے تو وہ کسانوں اور مزدوروں والی شاعری ہے۔ کسی رسالے کا فائل اُٹھا کر دیکھ لیجئے "مزدور کی لاش" "روزہ دار مزدور" "بھوکا ہندوستان" کی قسم کی نظمیں ضرور مل جائیں گی۔ لیکن لطیف صاحب تو اس تحریک کو پسند فرماتے ہیں۔ نثر نگاری میں ایک "ڈھرہ" ادب لطیف کے نام سے پیدا ہوا تھا سو وہ بھی ختم ہو چکا۔ ایک ڈھرہ ملا رموزی اور شوکت تھانوی نے چلایا تھا وہ بھی اب معدوم ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسا ڈھرہ ہے جو نہیں ہے اور چل رہا ہے۔

ذہنی عیاشی اور ادب کے مقاصد کا سوال بہت دلچسپ ہے۔ میری رائے میں یا تو "ذہنی عیاشی" کوئی بامعنی چیز ہی نہیں یا اگر ہے تو وہ نہیں ہے جو لطیف صاحب سمجھے ہیں۔ مجھے یہ بتایئے کہ کیا انسان کی

کوئی ایک حرکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کے پیچھے "ذہنی عیاشی" یا "جسمانی عیاشی" یا "جذباتی عیاشی" کارفرما نہ ہو۔ پہلی سانس سے آخری سانس تک انسان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن، اپنے جسم اور اپنے جذبات کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ مرد خدا جو اپنا سر کٹانے پر تیار ہو جاتا ہے وہ بھی سکون یا حصول مسرت کا جویا ہوتا ہے اور اس لئے اس کا سر کٹا دینا بھی ایک عیاشی ہے۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ "عیاشی" کو ایک بازاری جذبہ کیوں سمجھے ہوئے ہیں اور اگر حقیقتاً ذہنی سرخوشی کو آپ ادب کے لئے زہر سمجھتے ہیں تو پھر آپ کا بہترین ادب وہ ہے جو محراب مسجد یا خم کلیسا یا صحن بتخانہ میں جنم لیتا ہے۔ دیکھئے میں پہلے بھی عرض چکا ہوں کہ ادب کا مقصد ہمیں زندگی سے ڈرانا نہیں ہے بلکہ ہمیں زندگی کی غیر خوشگواریوں کو برداشت کرنے کے قابل بنا دینا ہے اور یہ مقصد اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ادب کو مطلق رنگ و نور بنا کر پیش نہ کیا جائے۔ آج دنیا میں اگر کوئی مذہب بھی کامیاب ہے تو وہ مذہب ہے جس کی تبلیغ عورت اور شراب کے سپرد ہے نہ کہ وہ جس کی باگ ڈور پیران سال خوردہ کے ہاتھ میں ہے؟

فضل الدین اثر ایم۔ اے

خواب کی دنیا

از

عبدالمالک آروی

آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص، خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر بہترین تصنیف مغربی اور مشرقی ادبیات کا دلچسپ اور مفید مجموعہ زبان شگفتہ، انداز بیان محققانہ، اسکے پڑھنے کے بعد آپ خواب کے بہت سے معمے حل کر سکیں گے، اس میں ڈاکٹر فرائڈ کی تصویر و حالات زندگی اور پیش لفظ حضرت نیاز مدظلہ بھی شامل ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۲، مجلد ۱۲/ ۔ اراکین ادارہ سے صرف ۱۰ اور ۱۲

پتہ:۔ معتمد اعزازی طاق بستان آرہ

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جنکی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں، قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵/۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۴/۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴/ فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) جنوری ۱۲/۔ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴/ فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴/ فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) فروری ۵/ (۱۹۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵/ فی پرچہ (۱۹۳۶ء) جنوری ۱۲/۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون و ستمبر) ۶/ فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۱۲/۔ مارچ تا اگست ۶/ فی پرچہ

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آپ کسی کی گلہ مندی پر برہم ہوجائیں، یہ آپ کی خوشی، لیکن غور تو کیجئے کہ یہ ہے کیا؟
سعدی کا شعر آپ نے سنا ہوگا۔

لازم ست احتمالِ چندیں درد
کہ محبت ہزار چندین ست

پھر یہ درد ہی ہے جو لب تک آکر شکایت ہوجاتا ہے اور یہ محبت ہی ہے جو بڑھکر درد ہوجاتی ہے۔ آپ کا یہ کہنا البتہ ایک حد تک درست ہے کہ وہ بات جو آپ سے کہنے کی تھی دوسروں سے کیوں کہی گئی۔ لیکن یہ دوسرا کون؟ میں! اس لئے آپ کو غصہ اس بات پر ہے کہ میں نے کیوں وہ بات سنی، مجھے کیوں آپ کی کمزوریوں کا علم ہوا۔

آپ کہیں گے یہ غلط ہے، اوروں سے بھی کہا گیا، لیکن میں جانتا ہوں آپ کا یہ کہنا صرف اسلئے ہوگا کہ یہی ایک تاویل آپ کرسکتے ہیں۔ بہرحال مطمئن رہئے۔ میں کسی سے ذکر نہ کروں گا اور مجھ سے اگر کہا گیا تو صرف اس لئے کہ آپ کے کانوں تک پہونچ جائے۔ شکایت کرنے والے نے جس نزاکت سے کام لیا ہے اسکی داد تو آپ دیتے نہیں اُلٹا برہم ہوتے ہیں، معقول!

تم سب باتیں کیا کرو، لیکن خدا کے لئے میرے سامنے سیاست نہ بگھارا کرو، تمھیں نہیں معلوم کہ یوں تم جتنے اچھے ہو، سیاست میں اتنے ہی بُرے ہو۔ یہ بات قیامت تک تمھارے ذہن میں نہیں آسکتی کہ قوم کی زندگی کا تعلق تمھاری انفرادی زندگی سے کیا ہے۔

کل ایک صاحب تشریف لائے، کسی بزرگ کی تعریف کرنے لگے کہ دنیا سے کس قدر بے تعلقانہ زندگی بسر کررہے ہیں اور رات دن ایک گوشہ میں بیٹھے اللہ اللہ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا اگر یہ کوئی اچھی بات ہے تو سب کو کرنا چاہئے اور اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ساری دُنیا میں اُلّو بولیں گے۔ پھر یہ ظلم تو

چنگیز و ہلاکو نے بھی نہیں کیا تھا۔

خدا تو حکم دیتا ہے "انتشروا فی الارض" زمین پر پھیل جاؤ۔ ہر جگہ چھا جاؤ اور یہ بزرگ کہتے ہیں کہ انسان سمٹ کر گم ہو جائے ― ایسا سمٹے کہ ہتیلی کا بنے تل قاتل

یہی حال تمہارا ہے کہ دنیا میں صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہو اور دامن کشاں گزر جانے کو بڑا کمال جانتے ہو۔ ساحل پر کھڑے کھڑے ڈوبنے والوں کا تماشہ دیکھنا تمہارے نزدیک حاصل انسانیت ہے اور میں اسے "طاغوتیت" سمجھتا ہوں ۔ جب آدم جنت سے نکالے گئے تھے تو شیطان بھی جہنم کے کنارے کھڑا ہوا انھیں دیکھ دیکھ کر اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ تمھیں معلوم نہیں ؟

تمہارا مسلم لیگ میں شرکت کا ارادہ کرنا، میرے لئے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تمھاری پروازِ خیال (عمل کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں) اس سے زیادہ بلند جا ہی نہیں سکتی۔ لیکن خیر، کچھ تو تمھارے اس "پتھر پن" میں کمی ہوئی، گو جونک تو اس میں اب بھی نہیں لگ سکتی۔

جاں پناہا ― نویدِ سرفرازی ملے اور میں اس کی تعمیل سے قاصر رہوں! اس سے زیادہ بخت کی نارسائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ تاہم کچھ تسکین ہے تو اس خیال سے کہ

بہر جا می روم شوقِ سجودت پیش می آید
دو عالم آستانِ تست اگر رفتم کجا رفتم

ذاتِ گرامی کا فیضان ایسا نہیں کہ مہجوری باعثِ محرومی ہو، اس لئے آستانہ اقدس سے دور ہونے کے باوجود اس قدر نزدیک ہوں کہ

نتواں ترا و جاں را بہم امتیاز کردن

میری خاموش نوائی پر جو بازپرس فرمائی گئی ہے، وہ ایسا معمولی التفات نہیں کہ میں اس معصیت کی لذت کو جلد فراموش کر سکوں۔

نمی دانم چہ نیرنگ ست افسونِ محبت را
کہ خود را ہم تو می پندارم و با خود سخن دارم

سجدۂ عبودیت قبول ہو!

کرمفرمائے من ― آپ کا اقتباس وانتخاب مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ "۔۔ دو شاعری

میں بھی ماہ و ہلال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن فارسی سے کیا مقابلہ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس مجموعہ میں کسی اور اضافہ کی گنجائش ہے، آپ نے سبھی کو لے لیا ہے، لیکن اسوقت دو شعر یاد آگئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے:۔

ہلال امشب بہ آں مستی بروں از پردہ می آید
کہ گوئی از مئے بزمت لبے ترکردہ می آید
بہ ایں ساماں کہ شد یا رب کُلاہ آرائے مستانت؟
کہ ماہ نو ہم از گردوں، قدح کج کردہ می آید

اس کے بعد اگر کوئی جام ایسا ہی اچھوتا ملگیا تو ضرور پیش کروں گا۔

نیاز نوازا۔ آپ نے جن الفاظ میں خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے۔ ان کا شکر گزار رہوں۔ اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ میری گزشتہ بیس سال کی جگر کاوی کا نتیجہ کیا نکلا۔

شعلہ چکدغم کرا، گل شگفد مزد کو !
شمعِ شبستانیم، بادِ سحر گاہیم

آپ نے اتنا پوچھ لیا تو ایسا معلوم ہوا کہ کونین مل گئے۔ خوش رہئے کہ آپ کو میری خدمات کا احساس تو ہے! میں کیا کرتا اگر آپ بھی "دامن کشاں" گزر جاتے۔

مستقبل کا ارادہ، حال و ماضی پر استوار ہوا کرتا ہے، اور یہاں یہ دونوں داغدار ہیں، اس لئے کیا بتاؤں کہ کل کیا ہوتا ہے۔ بہرحال جو کچھ کر رہا ہوں وہ یکسر مجبوری ہے اور آیندہ جو کچھ ہوگا وہ بھی اسی انداز سے ہوگا کہ

نہ دلِ نیاز خورم نہ لبِ امید خنداں

اس لئے اس ذکر میں کوئی لطف نہیں۔

زحمت نہ ہو تو کبھی کبھی یاد کرتے رہئے، اسوقت تک کہ مایوسی نے "راحتِ جاوید" کی صورت اختیار نہیں کی ہے۔

مکرمی، آپ نے بالکل درست فرمایا کہ وہ مجھ سے سخت برہم ہیں، لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ ان کی برہمی نہ میری ذات سے ہے نہ میرے اخلاق سے، بلکہ اس بات سے کہ میں کیوں دُنیا کے سامنے وہ بات کہتا ہوں جسے وہ پسند نہیں کرتے، پھر اس صورت میں آپ ہی بتائیے کہ

تا بکے سرفِ رضا جوئی دہا باشم

ایک ہو، دو ہوں، تو یہ بھی ممکن ہے، لیکن جب ہر وہ شخص جو مسجد میں اذان دے سکتا ہے، مجھ سے خفا ہو

تو میں کیا کرسکتا ہوں۔

خیر اس قصہ کو چھوڑیئے، یہ بتایئے کہ آپ تو مجھ سے خفا نہیں۔

بندہ نواز،

گرامی نامہ کا جواب دیر سے بھیج رہا ہوں اور معذرت خواہ ہوں، فرصت بھی تھی، کوئی خاص دماغی اُلجھن بھی نہ تھی، جواب کے لئے کوئی کاوش بھی درکار نہ تھی، لیکن کہولت و کاہلی ضرور تھی، اس لئے اگر آپ معاف نہ کریں گے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

غالب کے مذہب کے باب میں آپ کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں۔ مولانا حالی نے غالب کی ایک رباعی لکھی ہے جس کا ایک مصرعہ یہ ہے کہ

شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

لیکن اگر یہ اس کا تفنن نہ ہو تو بھی آپ اس رباعی کی کیا تاویل کریں گے:۔

شرط است کہ بہر ضبطِ آداب و رسوم　　خیزد لبعد از نبی امام معصوم

زاجماع چگوئی بہ علی بازگراے　　مہ جائے نشینِ مہر باشد نہ نجوم

تشیع کے لئے صرف اتنا ہی عقیدہ کافی ہے جو اس میں ظاہر کیا گیا۔ تحریک تبرہ میں شرکت ضروری نہیں۔

غالب اخلاق کے فلسفہ میں، زیادہ تر ضرورت و مصلحت کا پابند تھا اس لئے ہوسکتا ہے کہ ماوراء النہری والی رباعی محض بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے لکھدی ہو۔ تقیہ بھی تو اسی کو کہتے ہیں۔

اس کے کلام سے متعدد جگہ اس کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور غالباً میں اس مسئلہ پر کسی وقت مفصل گفتگو کرچکا ہوں۔ میر کے باب میں البتہ گفتگو ہوسکتی ہے اور بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ شیعہ نہ تھا۔

صدیقی۔ میں آپ کی یہ نظم کسی رسالہ میں دیکھ کر خاموش داد دیچکا ہوں۔ نظم کی بڑی خوبی اسکی یکسانیت ہے اور حُسنِ ترتیب کے ساتھ خیال کا تدریجی ارتقاء۔ اگر اس کا اختتام تمثیلی (ڈرامائی) انداز سے اشاراتی (Futurist) اصول پر ہو تو کیا کہنا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں اس رکھ رکھاؤ کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ آپ کی نظم محاکات کا اچھا نمونہ ہے، اگر اس میں تھوڑی سی ایثری لطافت بھی ہوتی تو بڑی بلند چیز ہوجاتی۔

تشبیہات اب زیادہ تر مرکب استعمال کی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں بہت لطف دیتی ہیں، آپ کا

بھی رجحان یہی ہے، لیکن افراط ہر چیز کی بُری ہے، اس لئے اعتدال کا خیال اس میں بھی رکھئے تاکہ دوسرے کو یہ نہ محسوس ہو کہ آپ کا مقصود یہی صرف تشبیہات سے کھیلنا ہے۔

ہندی شاعری کے مطالعہ سے آپ کو کوئی فایدہ نہ ہوگا، اس میں یہ رنگ نہیں ہے۔ تغزل میں بیشک اس سے مدد مل سکتی ہے۔ اگر آپ فارسی میں فردوسی، قاآنی، ساوجی اور بدر چاچ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اپنے ذوق کے لحاظ سے بہت سی نئی باتیں ان میں مل جائیں گی اُردو شعراء متاخرین میں انیس کو سامنے رکھئے۔ بیدل کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اگر ایک دفعہ اس کا چسکا لگ گیا تو آپ کا لکھنا پڑھنا سب چھوٹ جائے گا۔ اس بحرِ مواج میں غوطہ لگانے کے بعد اُبھرنا مشکل ہے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص نواز، آپ جسقدر جلد جواب چاہتے تھے، اتنی ہی زیادہ دیر ہوئی، کس قدر عجیب بات ہے۔ آپ برہم تو ہوں گے لیکن شاید نہ اس قدر۔ "کدخدائی یا تخدائی" کا استعمال جشنِ نکاح کے مفہوم میں صرف کنایۃً مجاز کی صورت سے ہے کدخدا کے معنے صاحبِ خانہ کے ہیں یہ مرکب ہے۔ کد اور خدا سے۔ کد بہ معنی خانہ اور خدا بہ معنی صاحب و مالک۔

فارسی میں بدآوازی اور "بے سُرے پن" کے لئے "کج نغمگی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایرانی موسیقی کی اصطلاح ہے۔

"کفن پھاڑنے" کا محاورہ اُردو میں "گھبرانے اور بیتاب ہو جانے" کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے، جیسے کفن پھاڑ کر بھاگ نکلے۔ یا کفن پھاڑ کر چیخ اُٹھے یعنی بیتاب ہو کر بھاگ نکلے یا بے چیخ اُٹھے۔ بیشک یہ محاورہ فارسی سے لیا گیا ہے لیکن ہاں مفہوم ذرا اس سے مختلف ہے، جب کسی سخت بیماری یا مصیبت سے نجات ملتی ہے تو "کفن پارہ کردن" بولتے ہیں۔

آپ کا دوسرا سوال بہت تفصیل طلب ہے، موضوع نہایت دلچسپ ہے لیکن کافی کاوش چاہتا ہے عام طور پر انگریزی کے جتنے الفاظ فارسی و عربی سے ماخوذ نظر آتے ہیں حقیقتاً اُن سے بہت زیادہ ہیں۔ کیا (Over) عبور کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے اور کیا (Down) ڈون[1] سے علحدہ کوئی چیز ہے آپ کا ادھر خیال بھی نہ گیا ہوگا۔

دیکھئے اگر فرصت ہوئی تو اس پر تفصیل سے کسی وقت لکھوں گا۔ آپ بھی کچھ مدد کیجئے اگر ممکن ہو۔

---

[1] "دون" نیچے کے معنے آتا ہے۔

باب الاستفسار

(خاکسار تحریک)

(محمد ابراہیم صاحب صدیقی - کانپور)

آجکل تحریک خاکسار سیاسی حیثیت سے ایک اہم موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے اور جو کچھ اس تحریک کے متعلق اسوقت تک اخبارات میں شایع ہو چکا ہے اُس سے پوری حقیقت کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے گزارش ہے کہ آپ براہِ کرم بذریعہ نگار اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں، خصوصًا اس تحریک کے سلسلہ میں علامہ مشرقی کے گزشتہ واقعات زندگی معلوم ہونا بہت ضروری ہیں۔

(نگار) اس میں شک نہیں کہ خاکسار تحریک بہت وسعت اختیار کرتی جاتی ہے اور قدرتًا ہر نئی تحریک کی بابت جستجو پیدا ہوتی ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کی جائے۔ میں نے اس تحریک کا غایر مطالعہ تو نہیں کیا، لیکن جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کے ظاہری و نمایشی طریق کار سے جو مقصود ظاہر ہوتا ہے، وہ غالبًا اس کے حقیقی مدعا سے علحدہ ہے۔

مولانا عنایت اللہ مشرقی جو اس تحریک کے بانی ہیں، اس میں شک نہیں بڑے فاضل انسان ہیں، لیکن محض فضیلت علمی کسی کی خوبی نیت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ حسن بن صباح بھی بڑا فاضل شخص تھا، لیکن اس کی فضیلت و قابلیت جس تحریک میں صرف ہوئی اس کا حال سب پر روشن ہے۔ اس سے میرا مقصود علامۂ مشرقی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں، بلکہ صرف اصولاً یہ ظاہر کرنا ہے کہ محض ان کی قابلیت پر بھروسہ کر کے اس تحریک کو قبول کر لینا مناسب نہیں، بلکہ تمام مالہ و ماعلیہ پر نظر ڈالکر فیصلہ کرنا چاہئے اور اگر واقعی ان کی نیت بخیر ہے

تو شرکت میں یقیناً کوئی حرج نہیں۔

میرے دل میں جو شبہات اس جماعت کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں، ان کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور مذہبیات سے بھی، یعنی میں سیاسی حیثیت سے بھی اس کو ہندوستان کے لئے مضرت رساں سمجھتا ہوں اور مذہبی حیثیت سے بھی۔

جس حد تک وردی، بیلچہ، قواعد اور ضبط اوقات وغیرہ کا تعلق ہے، اس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں اور خدمتِ خلق (جو اس کا مقصد بتایا جاتا ہے) اس کے اچھا ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اگر یہی تنظیم و عسکریت ہماری قومیت یا سیاست کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہو تو پھر یقیناً اس کے "دعوائے خدمتِ خلق" پر شک کرنا چاہئے۔

علامۂ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" جو تحریک خاکساران کی پہلی منزل بتائی جاتی ہے، اپنی ادبیت کے لحاظ سے یقیناً بڑا مرتبہ رکھتی ہے، لیکن آیات قرآنی کی تاویلات کے لحاظ سے، میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ میرا عقیدہ قرآن اور اسلام کے باب میں جو کچھ ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، میں نہ قرآن کو اس معنے میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اسلام کو میں جامد چیز سمجھ کر اس کے احکام میں کسی قسم کی تبدیلی کو کفر جانتا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ ان تاویلوں کو بھی پسند نہیں کرتا جن میں خواہ مخواہ کھینچ تان کر قیاس مع الفارق سے کام لیا جائے۔

قرآن نے جو درس اخلاق و اجتماع دیا ہے وہ اب سے تقریباً چودہ سو سال پہلے کی چیز ہے اور اسی نگاہ سے اس کو دیکھنا چاہئے۔ اگر ہماری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اس کے مقرر کئے ہوئے اُصول ناکافی ہیں تو ہم دوسرے اُصول تو بنا سکتے ہیں، لیکن ان کی کوئی تاویل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ہماری قومی یادگار ہے اور اس کو جوں کا توں قایم رکھنا ہمارا فرض ہے۔ آثار قدیمہ کا محکمہ پرانی عمارتوں کو صرف محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہے ان میں کسی اضافہ کرنے یا ان کے نقوش میں تبدیلی کرنے کا حق اسے حاصل نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب میں خود بھی اس قسم کی تاویلوں کو خدمتِ اسلام سمجھتا تھا، لیکن بعد کو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسے فتنہ کا دروازہ کھول دینا ہے جس سے سوائے قومی انتشار کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر قرآن اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے جو آیات سے متبادر ہے، کسی مسلمان کی سمجھ میں نہیں آتا تو بیشک اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کو ترک کر دے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں میں صرف دو ہی جماعتیں رہ جائیں گی ایک "یومنون بالغیب" والی اور دوسری "تارکین قرآن" کی لیکن تاویل کی صورت میں متعدد جماعتیں ایسی پیدا ہو جائیں گی جن میں سے ہر ایک اپنے کو مسلمان کہے گی اور اس طرح اجتماعی انتشار بہت زیادہ ہو جائیگا

چنانچہ میں دیکھ رہا ہوں، کہ اسوقت مسلمانوں میں، اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، شیعہ، سنی، خارجی، احمدی وغیرہ وغیرہ متعدد جماعتیں صرف اسی تاویل کی بدولت پیدا ہو گئی ہیں جنھوں نے ہمارے شیرازۂ قومی کو بالکل منتشر کر دیا ہے اگر عقل کی رہنمائی ہماری اجتماعیت کو خراب کرنے والی ہے تو اس کے مقابلہ میں وہ بے عقلی قابلِ ترجیح ہے جو ہم میں مرکزیت پیدا کر سکتی ہے۔ میری یہ رائے اُس وقت تک کے لئے ہے جب تک انسان جاہل ہے اور قومی تعمیر کے لئے مذہب ضروری سمجھا جاتا ہے ورنہ ترک مذہب کے بعد جو اجتماعیت نوعِ انسانی میں پیدا ہو سکتی ہو اس کی وسعت کی تو کوئی انتہا نہیں۔

ہاں تو مقصود یہ کہنا تھا کہ علامۂ مشرقی نے بھی تذکرہ میں صرف تاویلات سے کام لیا ہے اور شاید ضرورت سے زیادہ عقل آرائی صرف کی ہے۔ انھوں نے اسلام کو ترقی کے ایک مخصوص معیار کے لحاظ سے جانچنے کی کوشش کی ہے، اسلام کے نقطۂ نظر سے ترقی کا مفہوم متعین نہیں کیا۔ ان کی تمام تاویلات کا نچوڑ "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مومن کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اسکو سربلند ہونا چاہئے اور سربلندی یا ترقی کا مفہوم انھوں نے دولت، سرمایہ داری، تمدنی راحت و آسایش، سیاسی تفوق کو قرار دیکر حکم لگایا ہے کہ اسوقت جو قوم ان خصوصیات کی حامل ہے حقیقتاً وہی مسلمان ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں انگریزوں سے زیادہ زبردست مسلمان اور کون ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علامۂ مشرقی کی یہ تاویل نہ صرف مذہبی حیثیت سے نظامِ اسلامی کے لئے تباہ کن ہے بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی سخت خطرناک ہے۔ آپ خاکسار تحریک والوں سے گفتگو کیجئے تو وہ ملکی و قومی نقطۂ نظر سے اپنا کوئی نصب العین آپ کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے اور سوائے "خدمت نوعِ انسانی" کے وہ اپنا اور کوئی مقصد نہ بتا سکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ خدمت کا جذبہ نہایت بلند ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدمت سے مراد ان کی کیا ہے اور وہ کس قسم کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ خدمت صرف اس حد تک محدود ہے کہ مکان میں آگ لگے اور وہ بجھانے کے لئے دوڑ پڑیں، کوئی ڈوب رہا ہو اور وہ اس کو نکال لیں، موٹروں میں تصادم ہو جائے اور وہ زخمیوں کو اسپتال تک پہونچا دیں، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ملک میں اور بھی جماعتیں اس مقصد کو پورا کر رہی ہیں۔ اصل خدمت جس کی اسوقت ملک کو ضرورت ہے اس کا تعلق معاشیات سے ہے پھر ان سے پوچھئے کہ کیا بھوکوں کو کھانا کھلانا اور ملک سے افلاس و عسرت کو دور کرنا بھی ان کے نصب العین میں داخل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا اس کی تدبیر یہی ہے کہ انگریزوں کو جا جا کر سلام کیا جائے جنھوں نے ملک کو فقر و فاقہ میں مبتلا کیا ہے۔

ان کی وردی بیکار ہے اگر وہ ننگوں بھوکوں کے کام نہیں آتی، ان کی قواعد پریڈ لغو ہے اگر وہ غریبوں

کی مدد کے لئے کوئی تنظیم نہیں کر سکتی اور ان کا بیلچہ محض ڈھونگ ہے اگر وہ کسی کسان کے کھیت میں نہیں چلایا جاتا۔

بہرحال اگر ملک کی اقتصادی اصلاح کا سوال ان کے سامنے نہیں ہے (اور یقیناً نہیں ہے) تو یہ جماعت ہمارے درد کی دوا نہیں اور اگر ملک کی آزادی اس کے مقاصد سے علٰحدہ ہے تو

ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

یہ لوگ کسی سے چندہ نہیں لیتے، اور ہر خاکسار وردی، بیلچہ اور سفر وغیرہ کے مصارف خود برداشت کرتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی غریب اس میں شریک ہو ہی نہیں سکتا، اور ایسی تحریک جس میں ملک کی ۸۰ فی صدی آبادی شریک نہ ہو سکے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

معلوم ہوا ہے کہ وہ امراء سے بڑی بڑی رقموں کی امداد قبول کر لیتے ہیں، لیکن امراء کیوں ان کی مدد کرتے ہیں جبکہ ان کے پروگرام میں کوئی بات ایسی نہیں جس کے چلانے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو۔ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

برطانوی حکومت کا ہر افسر اس تحریک سے باخبر ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ اس کی بہت تعریف کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس میں شریک ہوں۔ پھر اس کو کیا غرض ہے کہ وہ اس میں دلچسپی لے، اس کا جواب اس سوال کو سامنے رکھ کر سوچنا چاہئے کہ خاکسار جماعت کیوں اولوالامر کی اطاعت فرض جانتی ہے، اور وہ کیوں یہاں انگریزی راج کے قیام کی خواہاں ہے۔

بغیر کسی فنڈ کے اور بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے اس تحریک کو اتنی جلد کامیابی حاصل ہو جانا، بغیر حکومت کے اشارہ وامداد کے ممکن نہ تھا اور حکومت کی امداد جس وعدہ پر حاصل کی جا سکتی ہے، ظاہر ہے۔

حال ہی میں شیعہ سنی نزاع کے سلسلہ میں بھی اس تحریک کے سالارِ اعظم نے بجز ہانہ حد تک حصہ لینے کا اعلان کیا تھا اور ہر چند وہ فی الحال سوائے پروپگنڈا کے اور کچھ نہ تھا، تاہم اس سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کسی وقت ملک کے سیاسی مسایل کو بھی "خدمت خلق" کے تحت لاکر کوئی عملی اقدام کریں گے اور اس کی نوعیت ملوکیت واستبداد کے استحکام کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

ظاہر ہے کہ لاکھوں انسانوں کی منظم جماعت اگر کسی حکومت کی طرفدار ہو جائے تو اس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس تحریک کی پشت پر یہی پالیسی کام کر رہی ہو۔

بہرحال یہ اور اسی قسم کے بہت سے شبہات ہیں جو اس تحریک کے خلاف دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس لئے میری رائے میں جب تک علامہ مشرقی اپنے سیاسی نقطۂ نظر کو واضح نہ کر دیں، کسی شخص کو اس میں

حصہ نہ لینا چاہئے۔

لیکن اگر وہ یہ کہدے کہ سیاسیات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے تو پھر ان سے پوچھنا چاہئے کہ وہ اطاعت اولوالامر کے مسئلہ کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ خالص اقتصادی اصلاح کو اپنا نصب العین قرار دیکر بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے جہل و افلاس کو دور کرنے کی تدابیر کیوں اختیار نہیں کرتے۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس کا کیا جواب دیں گے، لیکن جہاں تک قیاس کام دیتا ہے، وہ اس کا کوئی جواب دینگے اور نہ اپنے پروگرام میں کبھی اس چیز کو شامل کریں گے۔ اس لئے میں اس تحریک کو نہ صرف یہ کہ غیر مفید بلکہ ملک کے لئے مضرت رساں سمجھتا ہوں اور اس سے احتراز وا جتناب کی ہدایت کرتا ہوں۔

ان شبہات کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ جب ان کے مقاصد اس قدر سادہ وصاف ہیں تو ان بدگمانیوں کی کیا وجہ۔ لیکن لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے، کہ اس قسم کی تحریکوں کا حقیقی مقصد کبھی عام ممبروں کو نہیں بتایا جاتا، اسکے جاننے والے صرف حلقۂ باطن (Inner Circle) کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ وہ تو فی الحال صرف ایک جماعت ایسی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو مرکزی حلقہ کے احکام کی سرفروشانہ اطاعت کی عادی ہو جائے۔ رہا ان سے کام لینا، سو اس کی نوعیت اور موقعہ و محل کو وہی جانتے ہیں جو اس کے بانی ہیں۔ اس تحریک کی فوجی تنظیم کا سبب یہی ہے کہ اس طرح وہ ایک جماعت میں انقیادی روح پیدا کرکے اس کے دل و دماغ پر چھا جانا چاہتے ہیں تاکہ وقت پر اس کو انحراف وانکار کی ہمت نہ ہو۔ یہ نفسیاتی نکتہ ہے کہ جب انسان کا ذہن وجسم کسی خاص خیال و عمل کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اس سے انحراف بہت دشوار ہوتا ہے اور وہ اس پر قایم رہنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ فوج کا ہر سپاہی خوشی سے جنگ کے لئے آمادہ نہیں ہوتا بلکہ روز کی مشق نے اس کو تعمیل حکم کا عادی بنا دیا ہے، خواہ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے۔ چنانچہ بالکل اسی نفسیاتی اُصول پر جماعت خاکساران تعمیل حکم کی عادی بنائی جا رہی ہے تاکہ جسوقت علامۂ مشرقی یا ان کے مخصوص ظلوتیان راز ان غلامان بیلچہ بردار سے کام لینا چاہیں، تو وہ انکار نہ کر سکیں۔

اب رہا یہ امر کہ ان سے کیا کام لینا مقصود ہے، سو جماعت خاکساران کے معمولی ممبروں یا معمولی افسروں کو تو اس کا علم نہیں ہو سکتا، کیونکہ فوج کا سپاہی یہ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی ضرورت کہ اسے کس محاذ پر جانا ہے۔ رہگئے اہل ملک سو ان کو سمجھنا چاہئے کہ وہ جماعت جس کی تنظیم کو اسوقت تک حکومت ہند نے خوشی سے گوارا کیا ہو، جسکے مطالبات پورا کرنے میں پوری رواداری سے کام لیا جاتا ہو اور جس کی تعریف آئی۔ سی۔ اس کا پورا محکمہ کرتا ہو، اس کا مقصود کیا ہو سکتا ہے اور اس سے ملک کو جتنا نقصان پہونچے کم ہے۔

غالب و اقبال

(جناب محمد قطب الدین صاحب ام - اس - سی عثمانیہ)

کچھ حضرات کا یہ خیال ہے کہ غالب اپنے فلسفہ بے نظیر تخیل اور انداز بیان کی ندرت کے اعتبار سے اقبال کا پیش رو ہے اور یہ کہ یہ دونوں یکتائے روزگار ہستیاں بہت سی باتوں میں مشترک ہیں۔ میں ان حضرات سے ہم آہنگ نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا پیش رو حالی کہا جا سکتا ہے نہ کہ غالب۔

اقبال ایک خاص پیام کا حامل ہے اُس کا فلسفۂ حیات "یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم" ہے اور اس کا دل پسند موضوع فلسفۂ خودی و عمل ہے۔

غالب پہلے تو میں نہیں سمجھتا کہ کسی خاص پیام کا حامل ہے اور اگر ہے تو وہ پیام کیا ہے۔ اقبال خودی و خودداری کی تلقین کرتا ہے اُس کا کلام اُس کے کردار کا آئینہ دار ہے وہ خود غیور و خوددار ہے۔ وہ کسی امیر و سلطان کے در کی جبہ سائی نہیں کرتا۔ غالب کے قول و فعل میں جو خلیج حایل ہے وہ اُن کے حالات زندگی سے ظاہر ہے۔ اقبال کی زندگی۔

گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

کا سچا نمونہ ہے۔

غالب "ہر پیچ و تاب" ہوس سے "سلک عافیت" نہ توڑنے کی ہدایت تو کرتے نہیں لیکن سب کچھ حاصل ہونے پر بھی ہوس نے اُنھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اقبال کے دل میں حب وطن کی ایک کسک ہے۔ وطن کی خستہ حالی کا نظارہ اُس کو خون رلواتا ہے۔

غالب نے دلّی کی بربادی اور ظفر کی تیرہ بختی پر آنسو بہانا تو دور کی بات ہے قلم تک نہ اُٹھایا اور ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں قصیدہ لکھ بھیجا۔

اقبال مجادلۂ عقل و عشق میں تمام تر عشق ہے سراپا شوق ہے۔ اُس نے مولانائے روم سے یہ سیکھا:-

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظن است و حیرانی نظر

غالب مفتوح عقل و مغلوب گمان ہے راہ مذہب میں رہبری عقل کی اور خوب خوب رخنہ اندازی کی یہاں تک کہ اُنہیں جنت سے بھی محروم رکھا جو ہر مسلمان کی میراث ہے اور اُن کو یہ کلمہ پڑھا دیا۔ "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"
غرض دونوں میں مجھے دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔

اس بارے میں آپ مجھے اپنی رائے سے بذریعہ باب الاستفسار مطلع فرما کر ممنون فرمائیے۔

(نگار) یقیناً غالب و اقبال کا مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالب صرف شاعر تھا اور اقبال شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی
غالب وہ سب کچھ تھا جو ایک شاعر کو ہونا چاہیے اس لئے کامیاب تھا، اقبال چونکہ فلسفی شاعر تھے اور جو فلسفہ یا پیام انھوں نے پیش کیا وہ یکسر فاسزم تھا اس لئے کچھ نہ کھئے

غالب نے ملکۂ وکٹوریہ کی مدح لکھ کر کم از کم یہ تو ثابت کر دیا کہ وہ زمانہ شناس تھا، اقبال میں تو یہ سوجھ بوجھ بھی نہ تھی۔ غالب نے اگر صرف ایک ایسے بادشاہ سے غداری کی جس کا تباہ ہونا یقینی تھا، تو اقبال نے سارے ملک کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی۔

اقبال کے ملکۂ شاعرانہ کا میں بڑا مداح ہوں، لیکن اُن کے پیام و فلسفہ کا سخت مخالف۔ افسوس ہے کہ جس شخص کے سامنے "انسانیت" کا سوال ہونا چاہئے تھا، اس نے اپنی ساری عمر ایسا تنگ نظرانہ درس دینے میں صرف کر دی جس کا عنوان نیٹشے ہے اور انجام مسولینی۔

اعلان

اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو پچاس روپئے انعام دینا تجویز کیا ہے جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انھیں مذکورۂ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوا۔ اس کے علاوہ اکاڈمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں اور تمام مقالے سکریٹری اُردو اکاڈمی کے پاس ۲۰ر ستمبر تک پہونچ جانا چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکریٹری کو مطلع کر دیں۔

فہرست مضامین :۔ اشتراکیت ۔ فاسزم ۔ نازی ازم ۔ سامراج ۔ وطنیت ۔ سرمایہ داری ۔ بحیرۂ روم کی سیاست ۔ بحیر الکاہل کی سیاست ۔ امریکہ اور سیاست عالم ۔ وسطی یوروپ کی سیاست ۔ نو آبادیوں کی تقسیم ۔ ممالک اسلامی کی سیاست۔

سکریٹری اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(م - ز - بیگم - رانچی)

میرا ماضی نہایت پر از آلام و مصائب گزرا ہے اسی کی بدولت مجھے دو بار سینی ٹوریم کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب اچھی تو ہوئی ہوں لیکن اپنی مصیبتوں کے زخم ابھی تک تازہ ہیں جو بہت ممکن ہے پھر میری صحت کو خراب کر دیں۔ میرے اکثر ہمدردوں اور کرمفرماؤں نے مجھ سے یہی کہا کہ اس وقت تمہارے لئے بہترین علاج یہی ہے کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤ صرف حال کی خوش آیند باتوں پر غور کرو اور مستقبل کو امید افزا بنا کر دیکھو۔ کیا یہ طریقہ علاج واقعاً نتیجہ خیز ہے۔ اور اگر ہے تو اس پر عمل کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ میں نے تو بہت کوشش کی لیکن عاجز آ گئی ہوں اس لئے آپ سے دریافت کرتی ہوں۔

امید ہے آپ میری مدد کریں گے۔

(نگار) آپ نے اپنا پتہ تحریر نہیں فرمایا اس لئے مجبور ہوں کہ نگار ہی کے ذریعہ سے آپ کو جواب دوں۔

آپ کی تحریر پڑھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور اگر غم تقسیم ہو سکتا ہوتا تو میں بلا پس و پیش کچھ حصہ اُسکا آپ سے مانگ لیتا اور آپ کا بوجھ کچھ ہلکا کر دیتا، لیکن کیا کروں مجبور ہوں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا مشورہ دوں۔

سینی ٹوریم اور عورت ہندوستان کی لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ وہ عورت ہی کیا جو سینی ٹوریم کا منہ نہ دیکھے اور وہ سینی ٹوریم ہی کیا جہاں کوئی عورت نظر نہ آئے۔

غنیمت ہے کہ آپ کو دو بار سینی ٹوریم دیکھنے کی فرصت زمانہ نے دی، ورنہ آپ کی سیکڑوں بہنیں ایسی ہیں جنھیں ایکبار بھی اس کی مہلت نہیں ملتی۔

اس میں شک نہیں کہ غم کا بہترین علاج، غم کو بھلا دینا ہے یا اس کو گوارا کر لینا۔ لیکن یہ علاج صرف کہنے کا ہے کرنے کا نہیں، خصوصیت کے ساتھ عورت کے لئے تو یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

ہر چند آپ نے آلام ماضی کی تفصیل سے مجھے آگاہ نہیں کیا، لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ ان کی نوعیت کیا ہوئی۔ بہرحال اگر یہ انجام ہے محبت کا تو اس کا علاج (ہومیوپیتھی کے اصول پر) محبت ہی سے ہو سکتا ہے، اور اگر نتیجہ ہے ظلم کا تو آپ بھی کیجئے۔ عورت اگر انتقام لینے کی جی میں ٹھان لے تو مرد کا کس بل چار دن میں نکل جائے لیکن افسوس تو یہی ہے کہ اس کو مغلوب رہنے ہی میں زیادہ لطف آتا ہے اور قوی کا ضعیف کو پامال کر دینا فطرت کا قانون ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو واقعات سے مطلع فرمایئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پتہ بھی لکھ بھیجئے، ممکن ہے میں کوئی صحیح مشورہ آپ کو دے سکوں۔

نکاہات

اِن شاء ہٹلر

(اگر ہٹلر نے چاہا تو ــــــ)

جان کاب مشہور موٹر دوڑانے والا ہے۔ یہ ہر سال موٹر کی ریس میں شریک ہوتا ہے اور برابر رفتار بڑھاتا جاتا ہے۔ اس فصل کی دوڑ کے متعلق کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا ارادہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ میری نئی کار بالکل طیار ہے اور سالٹ لیک سٹی کے میدان میں اسے دوڑاؤں گا۔ اگر ہٹلر نے چاہا۔

اس کے اس فقرہ سے بظاہر مذاق ٹپکتا ہے، لیکن اس نے جو کچھ کہا واقعی سنجیدگی سے کہا اور ہے بھی یہی بات کہ جب تک ہٹلر نہ چاہے کچھ نہیں ہو سکتا۔

پہلے کاشتکار سے پوچھا جاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ دیکھو اگر موسم نے اجازت دی تو میں کاشت ضرور کروں گا ایک جہاز راں سے دریافت کیا جاتا تھا تو وہ جواب دیتا تھا کہ اگر ہوا نے اجازت دی تو وہ ضرور روانہ ہو جائے گا، ایک مسلمان سے اس قسم کا سوال کیا جاتا تو وہ کہتا "ان شاء اللہ" (اگر خدا نے چاہا تو۔۔۔۔) لیکن اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کر ہی نہیں سکتا جب تک ہٹلر نہ چاہے۔ اگر وہ چاہے تو سب کچھ ممکن ہے ورنہ پھر گفتگو کا کوئی موقع ہی نہیں۔

پیرس وہی ہے اور اس کی آبادی وہی، لیکن وہاں کا کوئی باشندہ نہیں کہہ سکتا کہ امسال گرمی میں وہ وچی کے چشمہ کا پانی پی سکے گا یا نہیں۔ اگر ہٹلر نے چاہا تو خیر، ورنہ اس کا کیا امکان ہے۔ وچی ہوٹل کا منیجر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ امسال اسے کوئی نیا مددگار بڑھانا ہے، کیونکہ ہٹلر کی مرضی اسے معلوم نہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا کا کاشتکار حیران ہے کہ وہ اپنی کاشت کو وسیع کرے یا نہیں کیونکہ معلوم نہیں ہٹلر اسے کامیاب ہونے دیگا یا نہیں۔

امریکہ کے چھاپے خانے یوروپ کے جدید نقشے چھاپنے کی اجازت چاہتے ہیں، لیکن وہاں کا محکمۂ تعلیم اس کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اسے ہٹلر کے ارادہ کا علم حاصل نہیں کہ وہ وہاں کے نقشے میں کیا تبدیلیاں کرنے والا ہے۔

جوٹ پرسٹہ لگانے والوں سے بنگال کے کاشتکار پوچھتے ہیں کہ اُن کی پیداوار کی کھپت بازار میں ہوگی یا نہیں وہ کہتے ہیں اگر ہٹلر نے چاہا تو ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

لوہے کے کارخانے سوچ رہے ہیں کہ ان کو امسال کس قسم کی چیزیں طیار کرنا چاہئے، لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ معلوم نہیں ہٹلر کیا صورت پیدا کر دے۔ الغرض دنیا کا کوئی کاروبار، کوئی صنعت ایسی نہیں، جو اس وقت برزخی دور سے نہ گزر رہی ہو، یہاں تک کہ اُدے شنکر مشہور رقاص بھی پریشان ہے کہ معلوم نہیں ہٹلر اس کو یوروپ جانے کا موقعہ دے گا یا نہیں۔ بل بے ہٹلر تیری خدائی!

بعض سیاسی اصطلاحیں

آجکل بعض سیاسی اصطلاحات کی صراحت اس طرح بھی کی جاتی ہے :-

سوشلزم :- تم دو گائیں رکھتے ہو، ایک اپنے پڑوسی کو دیدو

فاسزم :- تم دو گائیں رکھتے ہو، دونوں حکومت کو دیدو، کچھ دودھ تمھیں ملتا رہیگا

نازیزم :- گائیں خود ہی رکھو، لیکن دودھ حکومت کو دو، وہ فروخت کرکے کچھ دام تمھیں دیدے گی۔

کمیونزم :- حکومت دونوں گائیں چھین لیگی اور تمھیں گولیوں کا نشانہ بنادے گی۔

یوروپ کی موجودہ سیاسیات

اسوقت کی یوروپین سیاسیات کو سمجھنا ہو تو ذیل کی حکایت سنئے :-

ایک مرتبہ تین کچھوے کسی شراب خانے میں گئے اور ہر ایک نے علحدہ علحدہ شراب کا ایک گلاس طلب کیا جب گلاس آ گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس دام نہیں ہے، آپس میں فیصلہ کرکے ایک کچھوے سے کہا کہ تم گھر جا کر دام لے آؤ، اس نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر حاضری میں، میرا گلاس بھی ختم کر دو، انھوں نے کہا ایسا نہ ہوگا چنانچہ وہ چلا گیا۔

جب دو سال گزر گئے اور کچھوا واپس نہ آیا تو باقی دو کچھوؤں نے کہا کہ آؤ اب اس کا حصہ بھی ختم کر دیں، وہ کیا آئیگا، یہ سنتے ہی ایک گوشہ سے اُس کچھوے نے سر نکال کر کہا کہ "اگر تم نے ایک قطرہ بھی میرے گلاس سے پیا تو میں دام لینے نہ جاؤں گا"۔

دنیا کا امن وسکون

سوال :- دنیا میں امن وسکون کی طرف سے کب اطمینان ہوگا ؟

جواب :- جب اسٹالین اپنے بستر مرگ پر فرانکو کی بیوہ کو یہ خبر سنائے گا کہ میں نے مسولینی کی تجہیز وتکفین کے وقت معتبر ذریعہ سے سُنا ہے کہ ہٹلر قتل کر دیا گیا۔

اخبار نویس کا حشر

نل بنانے والا کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ دوبارہ دوچند دام لیتا ہے، ڈاکٹر کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ فوراً دفن کر دی جاتی ہے جج کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ قانون بن جاتی ہے، لیکن جب اخبار نویس سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ڈاکٹر اور جج سب اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

اگر وقت ضایع کرنا ہے

تو اپنے ٹیلی فون کے نمبر کو دوچند کیجئے اور اس میں پانچ کا اضافہ کر کے، ۵ سے ضرب دیجئے۔ اس میں ۱۹۳۹ (سالِ رواں) جمع کیجئے اور سال کے پورے دن ۳۶۵ کا بھی اضافہ کیجئے۔ اس کے بعد اپنے سال پیدایش کو منہا کیجئے اور ۶۱۵ اور کم کر دیجئے۔ اس کے بعد جو اعداد رہ جائیں گے، وہ بائیں طرف سے پہلے آپ کا ٹیلی فون نمبر بتائیں گے اور پھر آپ کی موجودہ عمر

قہقہہ کی درسگاہ

پیرس کی ایک نفسیاتی درسگاہ میں ہر ہفتہ باقاعدہ ہنسنے کی بھی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس درسگاہ کے انچارج ڈاکٹر پیری واشے ہیں۔ ہر اتوار کی صبح کو ٹھیک دس بجے مختلف قسم کے آدمیوں کا گروہ جس میں بچے بوڑھے، عورت مرد سب شامل ہوتے ہیں لکچر ہال میں جمع ہوتا ہے اور ڈاکٹر موصوف اپنی تقریر یوں شروع کرتے ہیں :-

"دوستو، تم یہاں ہنسنے کے لئے آئے ہو، ایسی فضا میں نہانے آئے ہو جو تمھاری صحت کو برقرار رکھنے والی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک غمگین سینہ، ایک بسورنے والا چہرہ، ایک کڑھنے والا دل کبھی انسان کو خوش رکھ سکتا ہے"

یہ سنکر سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔ "نہیں، کبھی نہیں"

اس کے بعد ڈاکٹر حکم دیتا ہے کہ پردے گرا دئے جائیں، چنانچہ دفعتاً ہال پر تاریکی چھا جاتی ہے اور

ڈاکٹر لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ " اپنی اپنی کرسیوں پر آرام سے بیٹھ جائیے، اور آنکھیں بند کر کے صرف سونے کا خیال کیجئے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے سنئے"

ہال پر خاموشی چھا جاتی ہے اور ڈاکٹر موصوف کہتا ہے :۔ "میں مطمئن ہوں، میرے دل میں سکون ہے، میں مضبوط ہوں، میرا دل قوی ہے، یعنے مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہے، میں بالکل صحیح و توانا ہوں" حاضرین بھی ان الفاظ کو دہراتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دفعتاً ڈاکٹر حکم دیتا ہے کہ " ہنسو، خوب ہنسو، جہاں تک ہنس سکتے ہو" اور اسی کے ساتھ ہنسی کا ریکارڈ چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو ہنسنے میں مدد ملے اس کے بعد پردے اُٹھا دئے جاتے ہیں، روشنی ہوجاتی ہے اور لوگ اپنے اپنے گھر واپس جاتے ہیں۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین رشید :۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں، دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشتِ زعفران تر و تازہ شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوش نمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ ر

واردات :۔ منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کاغذ طباعت اعلیٰ تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد صرف عہ ر

فکر و نشاط :۔ حضرت جوش ملیح آبادی پر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ ر

جنون و حکمت :۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی والہانہ رباعیات کا دلکش مجموعہ قیمت ۶ ر

شعلۂ طور :۔ (طبع ثانی) حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان جس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا اور جو نئی ترتیب اور بہت کچھ تازہ کلام کے اضافہ کے ساتھ شایع ہوا تھا، قریب الختم ہے۔ قیمت ۶ ر

تاریخ مغربی یورپ :۔ ڈاکٹر رابن سن کی کتاب کا با محاورہ ترجمہ ہے۔ اس میں یورپ کے طرز تمدن، معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا ہے۔ مترجمہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قیمت ۶ ر

دیوان غالب جرمنی :۔ دیوان مکمل ہے جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ جرمنی میں خاص طور سے چھپوایا گیا ہے۔ قیمت قسم اول دو روپے آٹھ آنے۔ قسم دوم ۶ ر قسم سوم بغیر جلد عہ ر

منیجر نگار لکھنؤ

کیا آپ کو معلوم ہے؟

نازیت کا بانی ایک انگریز تھا

اس کا نام "ہوسٹن اسٹورٹ چمبرلین" (Houston Stewart Chamberlain) تھا۔ یہ علم نباتات و علم العقاقیر (Medicine) سیکھنے کے لئے جرمنی گیا تھا اور وہاں پہونچکر ہر جرمن چیز سے اسے عشق ہو گیا، یہاں کا لٹریچر، یہاں کا فلسفہ، یہاں کی موسیقی، یہاں کی سائنس، الغرض یہاں کی ہر ہر چیز کا وہ دیوانہ وار عاشق ہو گیا۔ سوائے جرمن زبان کے کسی اور زبان میں لکھنا پڑھنا گناہ سمجھتا تھا۔ اس نے ایک تاریخ کی کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ مغربی یوروپ کی ترقی صرف آرین قوم کی وجہ سے ہوئی جس کی صحیح اولاد جرمن قوم ہے اور اسی کے تفوق سے یہ تہذیب برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کتاب کی بہت سی جلدیں قیصر نے خریدیں اور سارے ملک میں تقسیم کیں۔

۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۲ء کے میان یہ کتاب ہٹلر کے ہاتھ لگ گئی اور اس کے اندر اسے وہ چیز مل گئی جس کی اس کو جستجو تھی۔

یہی وہ شخص تھا جس نے ہٹلر کو ہٹلر بنایا اور جرمنی کا مستقبل نازی تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اس کا اثر نازی جرمنی میں اتنا زبردست تھا کہ ۲۷ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو ہزاروں مقالے اخبارات میں شایع ہوئے اور اس وقت تک متعدد کتابیں اس کے حالات زندگی و تعلیمات پر شایع ہو چکی ہیں۔

جاذب کیونکر ایجاد ہوا

کاغذ سازی کے ایک کارخانہ میں کسی ملازم کی غفلت سے جس نے مادہ ملانے میں کوئی غلطی کر دی تھی، کچھ کاغذ ایسا طیار ہو گیا جس کے اجزا اچھی طرح گھل مل نہ سکے تھے اور کھردرا سا تھا۔ اس غفلت کی سزا میں وہ آدمی نکال دیا گیا اور کاغذ گوشہ میں ڈال دیا گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس میں تو سیال شے کے جذب کرنے کی بڑی صلاحیت

پائی جاتی ہے اور اسی وقت سے جاذب کاغذ بننے لگا۔

اگر وہ شخص یہ غلطی نہ کرتا تو شاید آج بھی ہم سیاہی خشک کرنے کے لئے بالو ہی کا استعمال کرتے ہوتے۔

تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ناخن	۱½ انچ سالانہ	اسپ سوار	۱۴ میل فی گھنٹہ
بال	۱۶ انچ سالانہ	چیل	۱۲۵ میل فی گھنٹہ
گھونگا	۵۰ انچ ایک دن میں	موٹر بوٹ	۱۳۱ میل فی گھنٹہ
بادِ نسیم	۵ میل فی گھنٹہ	ٹرین	۱۳۱ میل فی گھنٹہ
تیز رفتار آدمی	۹½ میل فی گھنٹہ	بحری طیارہ	۴۴۰ میل فی گھنٹہ
مرغی	۱۲ میل فی گھنٹہ	آواز	۷۹۰ میل فی گھنٹہ
دوڑتا ہوا آدمی	۱۴½ میل فی گھنٹہ	آندھی	۱۲۰۰ میل فی گھنٹہ
ہاتھی	۲۵ میل فی گھنٹہ	بندوق کی گولی	۱۸۰۰ میل فی گھنٹہ
شکاری کُتا	۳۶ میل فی گھنٹہ	روشنی	۱۸۶۳۲۵ میل فی سکنڈ
پیام رساں کبوتر	۴۰ میل فی گھنٹہ		

ہوائی جہاز رانی کا مستقبل کیا ہے

امریکہ کے مشہور طیارہ ساز سکورسکی نے اپنے ایک حالیہ لکچر میں بیان کیا ہے کہ اس نے ایک ایسے جہاز کا ڈھانچہ طیار کر لیا ہے جس کا وزن ۱۰۰ ٹن ہوگا اور ۲۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرے گا۔ اسکی مشین ایسی ہوگی کہ مسلسل ۸ ہزار میل کا سفر بغیر زمین پر اُترے ہوئے ممکن ہوگا۔ اس میں علاوہ عملۂ جہاز کے (جو ۱۶ آدمیوں پر مشتمل ہوگا) سو مسافروں کی جگہ ہوگی۔ اس میں اوپر نیچے دو تختوں والی کوٹھریاں ہوں گی، بار روم ہوگا، باورچی خانہ ہوگا، عملۂ جہاز کے رہنے کی جگہ ہوگی اور ایک بڑا ہال ہوگا جہاں گانا بجانا، ناچنا کودنا اور سینما وغیرہ سبھی کچھ ہوگا۔ یہ جہاز امریکہ سے اُڑ کر سیدھا یوروپ جائے گا اور درمیان میں کسی جگہ نہ اُترے گا، اسوقت یوروپ و امریکہ کے اس سفر میں چار پانچ دن صرف ہوتے ہیں، لیکن اس جہاز کے ذریعہ صرف ۱۶ گھنٹوں میں یہ مسافت طے ہو جائے گی۔

سکورسکی کا بیان ہے کہ جدید اُصول کی بناء پر ہزاروں ٹن وزنی جہاز ایسے طیار ہو سکتے ہیں کہ ہزاروں مسافر ان پر سفر کر سکیں، لیکن ایسے جہاز غالباً جلد طیار نہ ہوں گے کیونکہ روزانہ یوروپ و امریکہ کے درمیان سفر کرنے والے مسافر اتنی تعداد میں اسوقت کہاں مل سکتے ہیں۔

برہا کی ماری

("سلمٰے راحت" کے نام۔ جس کے شعاع افگن دراز گیسو مجھے شاعر اور بے وقوف بنا کر ہی چھوڑیں گے)

غمگیں نگاہیں، رنگین گھٹائیں، اُترا سا چہرہ، شاداب سبزہ
جھولے کی پینگیں، برہا کی ماری، ہنسنا بھی چاہے رونا بھی چاہے

سکھیوں کی مانگیں ہلکی گلابی، ہاتھوں میں منہدی، ہونٹوں پہ مسّی
سکھیوں کے جھولے پہ رنجیدہ "شیلا" آنا نہ چاہے، آنا بھی چاہے

آموں کی ہولی کون اُس سے کھیلے، برباد نالے، ارماں بھرا دل
حسرت کی ماری، جینے سے عاری، کہنا بھی چاہے، سننا بھی چاہے

اندھیاری راتیں، پریتم کی باتیں، رہ رہ کے اُسکو یاد آتی جائیں
پی پی پپیہا باغوں میں بولے وہ روتے روتے گانا بھی چاہے

اُٹھتی جوانی، برہم اُمنگیں، آزردہ نظریں، ساجن کو ڈھونڈیں
جمنا کنارے سویا ہے پریتم، جانا بھی چاہے، لانا بھی چاہے

بےکیف شامیں، بیتاب باہیں، سونی مسہری، بیدار راتیں
در پر نگاہیں، ہونٹوں پہ آہیں، جینا بھی چاہے، مرنا بھی چاہے

(نوابزادہ) راحت سعید خاں بی اے (علیگ) علی گڑھ

دعوتِ آب و ہوا

لیلائے شب جبیں پر افشاں لگا رہی ہے
آئینے میں قمر کے زلفیں بنا رہی ہے

کاخوں سے چپکے چپکے سایہ اُتر رہا ہے
خورشید بے خودی کا دل سے اُبھر رہا ہے

گردوں سے ٹوٹ کر یوں تارے دمک رہے ہیں
گویا کہ آسماں کے آنسو ٹپک رہے ہیں

جنگل کے دامنوں میں گھومی ہوئی ہیں راہیں
کھیتوں میں جیسے کوئی بھرتا ہے سرد آہیں

ماتھے پہ شب کے ٹیکا یوں جگمگا رہا ہے
ہر ذرّہ مسکرا کر آنکھیں لڑا رہا ہے

رنگین جھاڑیوں میں جگنو بہک رہے ہیں
رہ رہ کے مہوشوں کے عارض دہک رہے ہیں

تاروں کے آئینوں میں تصویر ہے تمھاری
آنچل میں چاندنی کے تنویر ہے تمھاری

حوریں اُتر رہی ہیں جنّت سے ساغروں میں
کرنیں جڑی ہوئی ہیں جن کے حسیں پروں میں

اک روشنی سی میرے سینے میں ہو رہی ہے
ٹھنڈی ہوائیں دیوی فطرت کی سو رہی ہے

بدمست وادیوں میں اٹھلا رہے ہیں بادل
پلکوں میں رات کی پہ پھیلا ہوا ہے کاجل

زلفوں کا سر پہ پریاں سایہ کئے ہوئے ہیں
ہاتھوں میں جو ابد کی شمعیں لئے ہوئے ہیں

ہے اک چمک سی پیدا ذرات کی جبیں پر
یا دل دھڑک رہے ہیں عشاق کے زمیں پر

لچکا رہی ہیں شاخیں اپنی کمر چمن میں
چھایا ہے اک نشہ سا ہستی کی انجمن میں

ایواں میں ہے جنوں کے روحِ سروشؔ رقصاں
گھبرا کے ہو گئی ہے زلفِ خرد پریشاں

گلشن میں رنگ و بو کا پرچم اُڑا رہے ہو
کلیوں کی مخملوں میں کیوں مسکرا رہے ہو

آؤ کر پریت کی ہم اک بانسری بجائیں
گلرنگ ساغروں کی موجوں میں ڈوب جائیں

شرف احمد خاں سروشؔ ملیح آبادی

ساقی سے

صبا کی رو میں جنوں کا پیام ہو ساقی
بہار میرے گریباں کا نام ہے ساقی

مری حریص نگاہوں کے لب پہ روئیدہ
مرے جنوں کا مقدس سلام ہے ساقی

ہے اتفاق کہ کہتے ہیں جس طلسم کو جام
وہ مری زیست کا اک عرفِ عام ہے ساقی

مرا زمانۂ ہستی ہے موجِ نکہت و کیف
کہ عشق ہم نفسِ صبح و شام ہے ساقی

مرے مذاقِ نظر کے نگار خانہ میں
اُفق طرازیٔ حسنِ دوام ہے ساقی

تمام حلقۂ اربابِ علم جز من و تو،
نشاط و ہم و گماں کا غلام ہے ساقی

شعورِ کیف کی دولت ہے چند سینوں میں
خمارِ عقل کا احساس عام ہو ساقی -

گری ہے پھول کی پتّی زمیں کے سینے پر
بہارِ یک نفَسِ ناتمام ہے ساقی

ہیں میرے ذہن میں ڈوبے ہوئے جو سیّارے
اُنھیں طلوع کا پھر اذنِ عام ہے ساقی

یہ واقعہ ہے کہ اک ذی نظر کا ذہن و دماغ
صدف کا عرف ہے ساغر کا نام ہے ساقی

نہ پوچھ عشق کی وحشت خرامیوں کا عروج
فرازِ عرش مرے زیرِ گام ہے ساقی

یہ رند رہتا ہے چپ چپ جو تیری محفل میں
سخنورانِ جواں کا امام ہے ساقی

یہ معجزہ نہیں اک عام سی حقیقت ہے
عدم کے ہاتھ میں ہستی کا جام ہے ساقی

عدم

غزلیات

انجم رضوانی

مرے ضبطِ غم کی نہ پوچھئے کہ نہ بارِ رنجِ جہاں اُٹھا
جو دبی تھی آگ سلگ پڑی، دلِ غمزدہ سے دھواں اُٹھا

یہ ہے کھیل عشق کا ہمنشیں نہ سوالِ سود و زیاں اُٹھا
یہ جنوں کا کام ہے۔ عقل سے نہ کبھی یہ بارِ گراں اُٹھا

مری داستانِ وفا میں تھا وہ عجیب سوز و اثر نہاں
کہ عدو نے بھی جو کبھی سُنی تو بچشم اشک فشاں اُٹھا

وہ گھٹائیں جھوم کے آگئیں۔ وہ ہوا چلی۔ وہ جھڑی لگی
مرے ساقی آج تو یوں پلا کہ حجابِ ہر دو جہاں اُٹھا

سرِ بزم کس کی نگاہ ناز الجھ پڑی دلِ زار سے
کہ جہانِ درد لئے ہوئے کوئی گرم آہ و فغاں اُٹھا

نہ خیالِ رندی و زہد کر کہ یہ ساری بحث فضول ہے
جو بن آئے شیخ تو پی کے مے، کوئی لطفِ عمرِ رواں اُٹھا

وہی حال انجمِ زار ہے ہوا کب نصیب سکوں اُسے
نہ تھمی تھی دل کی تڑپ کہ دردِ جگر مزید براں اُٹھا

احمد ندیم قاسمی :-

اگر تو چاہے تو ذرے ذرے میں حسن کو بے نقاب کر دے مگر یہ انداز دو جہاں کو کہیں نہ محرومِ خواب کر دے

جسے میں دل میں چھپا کے ہو جاؤں بے نیازِ عروج و پستی مجھے تو اس شعلۂ حقیقت میں وہ شرر انتخاب کر دے

مری زبوں حالیاں اُسی کی رضا ہیں ورنہ اگر وہ چاہے تو میرے اشکوں کو اپنے دامن سے پونچھ کر آفتاب کر دے

وہ بخش آنکھیں جو خار میں دیکھ لیں چمن کی شگفتہ حالی وہ دل عطا کر جو ظلمتوں میں تجلیاں بے حجاب کر دے

وہ اِک قدم ناز سے اُٹھائے تو تھر تھرا کر گریں ستارے وہ اک نظر آنکھ بھر کے دیکھے تو چاند کو آب آب کر دے

تو چھپ گیا ہے تو اب ترے انتظار کی حسرتیں کہاں تک مجھے بھی صحرائے بے خودی میں خراب کر دے خراب کر دے

یہ انقلاب آئے گا کسی دن زمانہ یہ چال بھی چلے گا
خدا تجھے بھی ندیم کی آرزو میں محرومِ خواب کر دے

نبی احمد بریلوی :-

روداد اپنے غم کی اب کیا کہوں کسی سے لگتی ہے چوٹ دل پر تاروں کی روشنی سے

تیرِ نظر سے اپنے چھیڑو نہ میرے دل کو ناکام آرزو ہوں، محروم ہوں خوشی سے

ہوتا ہے ذکر میرا روز اُن کی انجمن میں ہے دشمنی غنیمت اب اُن کی دوستی سے

اے کاش تم نہ دیتے پھر دعوتِ نظارہ اے کاش میں نہ ہوتا ہشیار بیخودی سے

ناکامیوں نے دل کو گمراہ کر دیا ہے اب مجھکو کیا تعلق آدابِ زندگی سے

کیا جاؤں سوئے گلشن، دل میں ہے آگ روشن بڑھتی ہے اور وحشت پھولوں کی دلکشی سے

اے عشق پھر جگا دے جذباتِ زندگی کو تنگ آگیا ہے انساں غم ہائے بیکسی سے

برداشت کر رہا ہے صدمات دو جہاں کے کیا کام لے لیا ہے فطرت نے آدمی سے

صدمے ابھی ہزاروں سہنے پڑیں گے دل پر
کیوں عشق میں کسی کے گھبرا گئے ابھی سے

جنوری سنہ ۴۰ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے وہ اہلِ قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

حسب ذیل حضرات لکھ رہے ہیں، لیکن نہ کوئی عنوان کسی کے لئے مقرر ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک عنوان پر ایک ہی صاحب کا مقالہ ہو۔

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام ۔ اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام ۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد صاحب علوی بی ۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل ۔ احمد اکبر آبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبر آبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبد الباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق	=	جناب مخمور اکبر آبادی بی ۔ اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	=	جناب مولانا سیماب اکبر آبادی

(نوٹ) نظیر نمبر کی کتابت ماہ آیندہ شروع ہو جائے گی اس لئے براہِ کرم جلد توجہ فرمایئے اور اپنا مقالہ بھیجکر ہم کو موقع دیجئے کہ اس کے لئے موزوں جگہ نکالی جا سکے۔

نیاز

زنّار و ناقوس

(اُردو فارسی شاعری میں)

مختلف قوموں کے میل جول سے معاشرت و تمدن پر جو اثر پڑتا ہے، اس کا مطالعہ اگر لسانی حیثیت سے کیا جائے تو بعض حیرتناک انکشافات سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ مثلاً آپ زنار و ناقوس ہی کر لیجئے کہ یہ تو مذہبًا "سبحہ و اذان" کے یہ بالکل ضد ہیں، لیکن جب مسلمانوں کے تعلقات نصاریٰ، مجوس اور ہندوؤں سے زیادہ بڑھے تو یہی دونوں چیزیں اس قدر گوارا ہو گئیں کہ آخر کار تصوف اور متصوفانہ شاعری کی بنیاد ہی زنار و ناقوس اور بُت و برہمن کی محبت پر قائم ہوئی۔

زنار و ناقوس دونوں عربی الفاظ ہیں۔ زنار اس دھاگے کو کہتے ہیں جسے آتش پرست اپنی کمر میں باندھتے ہیں اور ناقوس سے لکڑی یا لوہے کا وہ بگل مراد ہے جو نماز کے وقت نصاریٰ کے یہاں بجایا جاتا تھا (جرس کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے)۔ اس لئے ہندوستان آنے سے قبل مسلمانوں کی فارسی شاعری میں جس زنار و ناقوس کا ذکر پایا جاتا تھا اس کا تعلق ہندوستان سے بالکل نہ تھا بلکہ ایران کے مغبچوں اور ترسازادوں سے تھا جو بعد کو خود ہندوستان کی فارسی شاعری میں بھی منتقل ہو گئے اور اس آزادی کے ساتھ کہ مسجد کی اینٹوں سے اُن کے گلی کوچے تعمیر ہونے لگے۔ غالب کہتا ہے:-

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر   خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم،

بعد کو جب ترکوں کا ایران پر تسلط قائم ہوا تو ایران والوں نے ان کو بھی موضوع شاعری میں شامل کر لیا اور اس حد تک غلو کیا کہ خواجہ حافظ ایک ترک کے خال کے عوض "سمرقند و بخارا" تک نثار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

الغرض یہ ذوق اتنا وسیع و عام ہوا کہ نظامی ایسا درویش صفت شاعر بھی ایک بار جب "بہ طلب گاری ترسا بچۂ بادہ فروش" خرابات میں پہونچا تو وہاں بھی اس کو یہی سننا پڑا کہ

گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند   سنگ بر شیشۂ تقویٰ زن و پیمانہ بنوش

اور کعبہ و مسجد کی اس توہین کو برداشت کیا کہ:-

این نہ کعبہ ست کہ بے پا و سر آئی بہ طواف — وین نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش
این خرابات مغاں ست درو رندانند — از دم صبح ازل تا بہ قیامت، مدہوش

لیکن اس زنار و ناقوس اور بت و برہمن کا حقیقی مقصود کیا تھا اس کو فیضی کی زبان سے سنئے:-

شکرِ خدا کہ عشقِ بتاں ست رہبرم — بر ملت، برہمن و بر دین آذرم
بُت چیست؟ بہ رخ نگاشتۂ معنی مُبیں — کاندر کلیسیائے ضمیرست مضمرم
اُستاد، برہمن کہ ز بُت خانۂ خیال، — در سجدۂ حضور فرود آورد سرم

عُرفی بت شکنی کے لئے جاتا ہے لیکن ایک بُت پرست برہمن کے اخلاق اپنے سے زیادہ بلند دیکھکر اپنا ایمان بھی وہیں چھوڑ آتا ہے:-

رفتم بہ بُت شکستن و ہنگام بازگشت — با برہمن گزاشتم از ننگ، دینِ خویش

امیر خسرو کے مسلمان ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن شاعری کی دنیا میں اُن کی کفر دوستی کا یہ عالم ہے کہ وہ کُھلم کُھلا اسلام سے بیزاری اور بُت پرستی کا اعلان کرتے ہیں:-

کافرِ عشقم، مسلمانی مرا در کار نیست — ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے، آرے، میکنم با خلق و عالم کار نیست

ابو تراب فتوت، نہایت زاہد و متقی قسم کے شاعر تھے، لیکن اپنے اسلام کی یکرنگی ظاہر کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو برہمن ہی کہتے ہیں اور خوشی سے زنار باندھ لیتے ہیں، ملاحظہ ہو:-

من برہمن مشربِ بت خانۂ یکرنگیم، — از رگِ سنگِ صنم سازید زنار مرا

خواجہ حافظ اپنے خرقۂ زہد کے نیچے بھی زنار ہی باندھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کسی دن یہ راز نہ کُھل جائے -

حافظ ایں خرقہ کہ داری تو بہ بینی روزے — کہ چہ زنار ز زیرش بجفا بکشایند

ایک اور جگہ وہ زنار کے مقابلہ میں اپنا زہد تک فروخت کرنے کے لئے طیار ہو جاتے ہیں:-

خرقۂ پشمینہ بفروشیم و بفروشیم زہد — در سر کوئے تو بر بندیم زنارے دگر

ظہوری کے ایمان کی استواری ہی زناربندی ہے، لکھتا ہے:-

ظہوری اگر راہزن زلف کیست — کہ زنار می بند و ایمان ما،

صائب، کفر و دین میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اور زنار کا ٹوٹنا اس کے نزدیک تسبیح کا ٹوٹنا ہے، کہتا ہے:-

دوئی نبود میانِ کفر و دین در عالم وحدت — دل تسبیح از گسستنِ زنار می ریزد

حضرت شیخ، اپنا ایمان ہی "برہمن زادۂ زنار بند" کی نذر کر دیتے ہیں:-

برہمن زادہٗ زنار بندے بُردہ ایمانم
کہ سودا می کنم با کفر زلفش دین و ایماں را

پھر یہ رنگ فارسی ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اُردو میں بھی پایا جاتا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اذان و تکبیر پر زنار و ناقوس کو اور محراب و منبر پر بت و بتکدہ کو ترجیح نہ دی ہو۔

غالب اس راہ کو ناہموار سمجھتا ہے جو تسبیح کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے، لکھتا ہے:-

زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

خیر، غالب کو جانے دیجئے کہ وہ ایک رندِ آزادہ رو تھا، لیکن مومن کو کیا کہئے گا کہ باوجود نہایت متعصب مسلمان ہونے کے بُت پرستی اختیار کر لیتا ہے:-

مومن دریند ارنے کی بت پرستی اختیار
ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

بلکہ وہ کعبہ کی طرف جانا گمراہی سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اللہ ری، گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

پھر لطف یہ ہے کہ اس باب میں جس طرح مسلمان شاعروں نے وسعتِ نظر سے کام لیا اسی طرح ہندوؤں نے بھی۔

راجہ بلوان سنگھ جو نظیر اور میرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے اپنے آپ کو زنار کا پابند بنانا پسند نہیں کرتے، کہتے ہیں:-

شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے
ہوں گے پابند نہ ہم سبحۂ و زنار کے پر

دوسری جگہ شیخ جی کی بت پرستی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:-

لائے کس بُت پہ ہیں ایمان کوئی پوچھو تو
شیخ جی پہنے جو زنار چلے آتے ہیں،

پنڈت شیو ناتھ باوجود ہندو کے اپنے دین و ایمان کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں:-

عدو ہے وہ برہمن زادہ میرے دین و ایماں کا
پسند آیا جسے زنار میرے رشتۂ جاں کا

پنڈت چکبست لکھنوی بت خانہ و حرم اور اذان و ناقوس کو بالکل ایک چیز سمجھتے ہیں:-

اذاں دیتے ہیں بت خانہ میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں،

مسلم جماعت تو اسے بھی گوارا نہیں کرتی کہ مسجد کے سامنے سے ہندو باجہ بجاتے ہوئے گزر جائیں، لیکن چکبست حرم میں ناقوس پھونکتا ہے اور مسلمان کچھ نہیں کہتے، بت خانہ میں اذان دیتا ہے اور ہندو خاموش ہیں۔

ریاض مرحوم نے بھی ایک بار جب ان کا گلا بیٹھ گیا تھا تو بجائے اذان کے کعبہ میں ناقوس ہی

پھونکا تھا :-

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبہ میں بھلے کو ہم دبالائے تھے ناقوس برہمن کو

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ شاعری میں ناقوس وزنار کا اصل مفہوم ہی کچھ اور ہو گیا تھا، اس شعر سے ملتا ہے :-

بند ناقوس ہوا سن کے ندائے تکبیر زلزلہ آہی گیا رشتۂ زنار پہ بھی

یہ سلام کا شعر ہے اور اس کا تعلق حادثۂ کربلا سے ہے، یعنی اس کا تعلق متغزلانہ شاعری سے بالکل نہیں ہے، لیکن پھر بھی ناقوس وزنار کا استعمال اصل مفہوم سے بالکل ہٹ کر کیا گیا ہے۔

کربلا میں جو حریف مقابل تھا شاعر نے اُس کو محض اس کی گمراہی کی وجہ سے ناقوس وزنار سے تعبیر کیا۔ تغزل میں تو خیر زنار و ناقوس نسبت تضاد کی حیثیت سے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن اس شعر میں تو یہ نسبت بھی حاصل نہیں ہے اور اس لئے ان الفاظ کا تعلق مذہبًا کسی فریق سے بھی نہیں ہے۔

شاعری کا لطف فی الحقیقت اس کے استعارات وکنایات ہی میں پنہاں ہے یہاں تک کہ جتنا نمایاں تقابل (Contrast) استعمال الفاظ میں پیدا کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ لطف آئے گا۔ اور یہ ایک ایسا مسلمہ مسئلہ ہے جس میں بحث واختلاف کی گنجایش ہی نہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مسلمان شاعر کھلم کھلا اپنے آپ کو بت پرست کہتا ہے اور اس کے اسلام سے کسی کو انکار نہیں ہوتا اور ایک ہندو شاعر زنار و ناقوس چھوڑ کر حرم کا طواف کرتا ہے اور وہ بدستور ہندو بنا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی دُنیا سے زیادہ صُلح کل وامن پسند دنیا کوئی نہیں اور اگر انسانی تمدن وسیاسیات میں بھی یہی شاعرانہ اخلاق پیدا ہو جائے تو پھر یہی عالم ہماری جنت ہے اور یہیں کی زندگی فردوسی راحت وآسایش!

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت
کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری تا دسمبر ۳۸ء شایع ہو چکی ہے اُسکے کچھ فارم زاید چھپوا لئے گئے تھے چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں لیکن فایل کے علاوہ تاریخ علٰحدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، ونیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت معہ محصول عہ/ ہے۔

مینجر نگار لکھنؤ